آنچل
کراچی
Naeyufaq.com
قیمت =/120 روپے

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: مکان نمبر B-1 مدینہ اسٹریٹ بالمقابل انٹر بورڈ آفس، نارتھ ناظم آباد کراچی 74700


سرورق: صدرہ جبار..... آرائش: روز بیوٹی پارلر ..... عکاسی: موسیٰ رضا




خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200
03008264242 کے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل: Info@naeyufaq.com

editor_aa@naeyufaq.com
www.facebook.com/EDITORAANCHAL

# سرگوشیاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ستمبر 2022ء کا آنچل آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

اس بار پکا ارادہ تھا کہ اس ماہ کا شمارہ جلد پیش کرنے کی کوشش کریں گے مگر ہمارے ساری محنت پر بجلی گر گئی، کراچی بجلی کمپنی کے شدید عذاب میں مبتلا ہے۔ اب تو حد ہے سارا سارا دن، ساری ساری رات بجلی غائب رہتی ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب آئی اور کب چلی جائے گی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس تیزی سے ہو سکا ہمارے تمام ساتھیوں نے جی جان لگا کر آپ کے لیے پیارا سا شمارہ تیار کر لیا اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ تک کب پہنچتا ہے۔ بجلی نے غائب ہونے کا معمول بنا رکھا ہے۔ عوام چاہے جتنا شور مچاتے رہیں بجلی کمپنی اپنی ہی من مانی کر رہی ہے اور اپنے مانے بل بھی بھیج رہی ہے۔ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ ادارہ کی پوری کوشش ہے کہ کوئی خامی نہ رہے لیکن اگر پھر بھی کمی محسوس ہو تو ہماری مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے نظر انداز کر دیجیے گا۔

وطن عزیز کا موسم آج کل بڑا سہانا ہے آج کل کراچی میں بھی خوب جم کر بارشیں ہو رہی ہیں اور شہری اور صوبائی حکومت کی نااہلی بھی خوب جم کر سامنے آ کر عوام کو آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہیں۔ وطن عزیز کے دیگر تمام شہروں، علاقوں میں خوب گرج چمک کے ساتھ برسات ہو رہی ہے۔ بارش اللہ سبحان وتعالیٰ کی رحمت ہے، پیاسی زمین پیاسے لوگوں کی پیاس مٹانے کا قدرتی ذریعہ ہے اور رحمت الٰہی کا نزول بھی لیکن ہم، ہمارے حکمران اور انتظامیہ اپنی نااہلی اور غفلت کے باعث اس رحمت کو زحمت میں بدل دیتے ہیں، انتظامی اداروں کی آپس کی چپقلش اور اختیارات کی رسہ کشی کام کرنے دیتی ہے نہ کوئی کام ہوتا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو نکاسی آب کے نالوں اور سیوریج لائنوں کے بجائے سڑکوں، گلی، کوچوں میں بہتا ہوا لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر زحمت بن جاتا ہے۔ یہ حکمرانوں اور ان کے ماتحت اداروں کی نااہلی ہے۔ بدعنوانی، کرپشن میں ملوث لوگ ملنے والے فنڈز کو درست استعمال کرنے کی جگہ غلط طریقے سے ہضم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کراچی شہر کا کوئی پرسان حال نہیں، بلدیاتی ادارے ہونے کے باوجود بلدیاتی ادارے غیر فعال ہیں کیونکہ انتظامی اختیارات کا جھگڑا چل رہا ہے، صوبائی حکومت خود بلدیاتی کام کر رہی ہے اور نہ ہی بلدیاتی ارکان کو کام کرنے دے رہی ہے، مسئلہ کروڑوں کی رقم کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔ کراچی میں پیش گوئی کے مطابق ہی بارشیں ہو رہی ہے اور یہ کسی قیامت صغریٰ سے کم نہیں، حکمرانوں سے گزارش ہے کہ وہ کسی بڑے حادثے کے رونما ہونے سے پہلے اس کا تدارک کر لیں تو بہتر رہے گا آگے جو حکم ربی۔

اس ماہ کے آنچل میں ہم سب کی پسندیدہ مصنفہ بہن ام طیفور کا خاص موضوع پر تحریر شدہ مکمل ناول شامل اشاعت ہے۔

امید واثق ہے کہ آپ سب کو یہ ناول ضرور پسند آئے گا۔

اس ماہ بہن نازیہ کنول نازی کی ناسازی طبیعت کے باعث قسط "وہ جو عشق تھا" شامل اشاعت نہیں۔

اس ماہ کے ستارے۔

ام طیفور، ماہ جبیں تارڑ، شیخ نزہت جبین ضیاء، سلمیٰ غزل، حنا اشرفی۔

اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

مدیرہ

سیدہ نثار



# حمد

دعاؤں کے لیے جس وقت ہاتھ اپنے اٹھاتا ہوں
تو دل کی تیرگی، میں آنسوؤں سے کھو پاتا ہوں
عجب حکمت کا پرتو چار سو محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے تتلیوں کا خوشنما ملبوس ہوتا ہے
سفید و سرخ تو نے یوں عبائیں دی ہیں پھولوں کو
شریعت جیسے کرتا ہے عطا اپنے رسولوں کو
تعاقب میں کہیں شب دوڑتی ہے روز روشن کے
کہیں پھل دینے لگتے ہیں شجر بے پھول، آنگن کے

مہیا رزق کرتا ہے کہیں بھوکے پرندوں کو
کبھی پانی نہ دے کر مبتلا کرتا ہے بندوں کو
کہیں قوت کا مظہر اپنی، صرصر کو بناتا ہے
سمندر میں کبھی بچوں کے قاتل کو بہاتا ہے
یہ گل شبو، یہ سنبل، کیوڑہ، خس سارے کیف انگیز
فضائیں زعفرانی ہیں کہیں مشک اور عنبر بیز
ہدایت کے لیے آیات روشن چاند تاروں میں
کہ جیسے نور پھیلاتے ہیں جگنو تیرہ زاروں میں
کہیں تو ہاتھیوں والوں کو عبرت کا نشاں کر دے
کبھی اونچے مکاں والوں کو پل میں بے مکاں کر دے

دھنک قدرت نے تیری، یوں اڑھائی آسمانوں کو
کساء میں جیسے ڈھک لیتا ہو کوئی پاک جانوں کو
سراسر کفر ہے نعمت کو جھٹلانا تری یارب
یہی کچھ حمدیہ اشعار ہیں کاوش مری یارب

خواجہ ثقلین

# نعت

دل روح کو قرار آئے کرو بات مدینے کی
زندگی میں بہار آئے کرو بات مدینے کی

سنی غور سے جائے گی بیزاری نہ آئے گی
ہر بات پہ پیار آئے کرو بات مدینے کی

جس بات پہ ہر قدسی الفت سے عقیدت سے
ہونے کو نثار آئے کرو بات مدینے کی

اک عمل بتا دوں میں کر لینا جو چاہتے ہو
گر تجھ کو تند ہار آئے کرو بات مدینے کی

جب نکلو مدینے کو وجدان کی صورت تم
جب تک نہ دیار آئے کرو بات مدینے کی

بھلا لاکھوں کا مجمع ہو بھلا سارے بیگانے ہوں
طبیعت پہ نہ بھار آئے کرو بات مدینے کی

شبیر عبادت میں اس عمل کے صدقے سے
ہر سانس شمار آئے کرو بات مدینے کی

شاعر شبیر حسین شبیر

editor_aa@naeyufaq.com
www.facebook.com/EDITORAANCHAL

**نازیہ کنول نازی ...... ہارون آباد**

پیاری نازی! سدا شاد و آباد رہو، آپ کی طبیعت کی خرابی کا علم ہوا جس کی وجہ سے آپ اس بار قسط بھی نہیں لکھ پائیں، ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کو کامل صحت سے نوازے، آپ کا سایہ آپ کے بچوں کے سر پر قائم رہے تندرستی اور خوشیوں کے ساتھ آمین۔

**نزہت جبین ضیاء ...... کراچی**

پیاری نزہت! سدا سہاگن رہو، اللہ سبحان و تعالیٰ نے آپ کے گھر پوتی کی صورت میں اپنی رحمت اتاری آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو بے حد مبارک ہو، اللہ سبحان و تعالیٰ ماں اور بچی کو عمر دراز عطا فرمائے آمین۔

**صائمہ قریشی ...... آکسفورڈ**

اچھی صائمہ! سدا سکھی رہو، پچھلے دنوں علم ہوا آپ کی والدہ کی ناسازیٔ طبیعت کا سن کر بہت پریشانی ہوئی۔ اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان کا سایۂ شفقت تادیر آپ کے سر پر قائم و دائم رکھے آمین۔ قارئین سے بھی دعا کے ملتمس ہیں۔

**ام ایمان قاضی ...... نیرہ غازی خان**

ڈیئر ام ایمان! سدا شاد رہو، آپ کے نانا کے انتقال کا سن کر بے حد افسوس ہوا، ہر ذی نفس کو دنیا میں آنا ہے اور ایک نہ ایک دن جانا ہے اللہ سبحان و تعالیٰ کے حکم سے۔ ہم دعا گو ہیں اللہ سبحان و تعالیٰ سے کہ وہ آپ کے نانا کو اپنی جوارِ خاص میں جگہ عطا فرما کر ان کی کامل مغفرت و بخشش فرمائے اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت و بخشش کے ملتمس ہیں۔

**منیف ریحان گیلانی ...... لاہور**

پیاری صدف! جگ جگ جیو، اللہ سبحان و تعالیٰ نے والدین کا نعم البدل نہیں رکھا اور یہ اللہ سبحان و تعالیٰ کی ایک خاص نعمت ہے جس کی جتنی بھی قدر کی جائے اتنا ہی کم ہے۔ آپ کے والد گرامی کے انتقال کی خبر سن کر بے حد دکھ و افسوس ہوا۔ والد ایک سایہ دار درخت کی طرح ہوتے ہیں جس کے سائے میں اولاد چین و سکھ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی ہے اور جب والد ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتے ہیں تب پتا چلتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہم اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کے والد کی کامل مغفرت و بخشش فرما کر ان کو اپنی جوارِ رحمت میں خاص جگہ عطا فرمائے اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت و بخشش کے ملتمس ہیں۔

**سارہ عمر ...... سعودی عربیہ**

ڈیئر سارہ! سدا سہاگن رہو، آپ کو اللہ سبحان و تعالیٰ نے اپنی نعمت یعنی بیٹے سے نوازا ہے بے حد مبارک ہو، ہم دعا گو ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ اور بیٹے کو صحت و تندرستی کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے آمین۔

**سعدیہ ہما شیخ ...... سرگودھا**

پیاری سعدیہ! سدا آباد رہو، پچھلے دنوں آپ کے ماموں کے انتقال کی خبر سن کر بے حد دکھ ہوا۔ ہم اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ مرحوم کی کامل مغفرت و بخشش فرمائے اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔

**نمرہ شاہین ...... کلر سیداں، پنڈی**

پیاری نمرہ! سدا مسکراتی رہو، گڑیا آپ کی شکایت بجا ہے کہ ہم تین ماہ سے آپ کی ڈاک شامل نہیں کر رہے تو اس کی وجہ ڈاک کا کافی تاخیر سے ملنا ہے اور اس ماہ بھی آپ کی ڈاک ابھی موصول ہوئی ہے جب پرچا فائنل ہو رہا ہے، دیکھیں ہم نے جواب دے دیا اور کوشش کرتے ہیں کہ آئندہ میں بھی آپ کو شامل کر لیا جائے۔ آپ کی دو کہانیاں جو اپریل میں موصول ہوئی تھیں ان کے بارے میں ہم نے درجواب آں کے آخر میں شائع ہونے والی ناقابلِ اشاعت کی فہرست میں لکھ دیا تھا شاید آپ نے پڑھا نہیں۔ "مغالطہ" اور "کم بخت محبت" کے لیے معذرت، ابھی آپ کو مطالعے کی ضرورت ہے آپ کے لیے ہمارا



یہی مشورہ ہے کہ فی الحال لکھنے کی طرف توجہ کم کر کے نامور افسانہ نگاروں کو بغور پڑھیں تاکہ آپ کے لکھنے کی صلاحیت بہتر ہو سکے۔ امید ہے آپ کی تشفی ہوئی ہوگی۔

**صبا اسحاق مغل ...... ننکانہ صاحب**

ڈیئر صبا! جیتی رہو آپ کی چار سال بعد آمد خوش گوار جھونکے کی طرح محسوس ہوئی اور آپ کے گھریلو حالات جان کے بے حد افسوس ہوا اور آپ کے والد گرامی کے انتقال کا پڑھ کر دکھ ہوا، ہم اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ مرحوم کی کامل مغفرت و بخشش فرمائے اور آپ سمیت تمام لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین۔ ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں اور قارئین سے ملتمس ہیں کہ وہ بھی آپ کے حق میں دعا کریں کہ آپ کے تمام مسائل جلد حل ہو جائیں۔

**شہرین اسلم ...... بہاول پور**

پیاری شہرین! سدا شاد رہو، آپ کی ڈاک تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے پچھلے ماہ آپ کو جواب نہیں دیا جا سکا اس ماہ آپ کو شاملِ اشاعت کر رہے ہیں۔ یہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ آپ آنچل تیرہ سال کی عمر سے پڑھ رہی ہیں اور آپ نے اس سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ بس ہمارا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ پڑھنے والے اچھی اچھی چیزیں پڑھیں اور اس میں پوشیدہ رموز و سبق کو جان کر اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھال لیں۔ دعاؤں کے لیے اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے آمین۔

**حرا افتخار ...... مقام نامعلوم**

ڈیئر حرا! سدا سکھی رہو آپ کا خط کافی تاخیر سے موصول ہوا جس میں آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا، آئندہ اس بات کا خیال رکھیں کہ اپنے نام کے ساتھ شہر کا نام ضرور لکھا کریں۔ دوسری بات آپ اور آپ کے شوہر مستقل سلسلوں میں شرکت کر سکتے ہیں اور ایک ہی لفافے میں رکھ کر اپنی نگارشات بھی بھیج سکتے ہیں پر ہر سلسلے کے لیے علیحدہ کاغذ کا استعمال کریں اور اس کے ساتھ اپنا نام و شہر کا نام بھی لکھیں۔

**حرا گل ...... لوگی**

ڈیئر حرا! سدا مسکراتی رہو، آپ کی آمد اور آنچل پسند کرنا بہت اچھا لگا۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ لڑکپن سے ہی آنچل پڑھ رہی ہیں اور اب خود بھی ماشاء اللہ سے دو بچوں کی امی جان بھی بن گئی ہیں۔ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کے گھر کو سدا اپنی امان میں رکھے۔ دعا کے لیے جزاک اللہ۔

**جیا علی ...... گوجرانوالہ**

پیاری جیا! ڈھیروں دعائیں، آپ کی تحریروں سے صدی کی نوکری کو دور رکھنے کا مشورہ صادر کر دیا گیا ہے اور کوئی حکم؟ محبت بھرے اظہار کا شکریہ۔ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کو اپنی عافیت میں رکھے آمین۔

**سلمیٰ اعوان ...... میانوالی**

سلمیٰ جی! سدا خوش رہو، بہت خوبصورت انداز میں لکھا گیا دعائیہ خط پڑھ کر آپ کے لیے دل سے دعا نکلی۔ بے شک آپ سے دل کا رشتہ قائم ہے اور ان شاء اللہ قائم رہے گا آپ سمجھدار ہیں، ہماری مجبوری کو خوب سمجھتی ہیں۔ دنیا میں بہت کم موضوعات ہیں جنہیں الفاظ میں ڈھالنا، الگ الگ مصنفین کی پہچان ہے۔ معمولی سی بات کو بھی اچھے لفظوں میں، خوب صورت اسلوب میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن موضوعات وہی رہیں گے۔ یہ مصنفین کی بھی مجبوری ہے آپ اپنی پسند کے موضوعات لکھ کر بھیج دیجیے ہم مصنف کو اطلاع دیں گے لیکن یہ لازم نہیں کہ مصنف آپ کے موضوعات کو کسی اچھی تحریر میں ڈھال دیں جو آپ کو پسند آئے۔ وہ اپنے ہی ذہن سے لکھیں گے۔ سمجھ میں آ گئی ناں بات؟

**افشین سلیمان ...... اسلام آباد**

ڈیئر افشین! سدا خوش رہو، شکوہ واپس لے لیں ہمیں آپ کی ڈاک موصول نہیں ہوئی۔ یہ پہلا خط ہے جو موصول ہوا ہے اور ہم فوراً جواب دے بھی رہے ہیں کہ ہماری افشین کے دل کو تسلی مل جائے۔ تمام مصنفین کو آپ کی پسند پہنچا دی گئی۔ نظم اور غزل شعبہ کو بھیج دی، وہی فیصلہ کرے گا کہ چھپے گی یا نہیں۔ ہم سب کی طرف سے دعائیں قبول کیجیے۔

**مہوش ...... کوئٹہ**

پیاری مہوش! سدا مسکراتی رہو اپنا نام صاف صاف لکھا کیجیے بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ مہوش پر اکتفا کیا۔ ہاں پاکستان کے حالات کچھ پریشان کن تو ضرور ہیں مگر "امید بہار" رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ سبحان و تعالیٰ نے پاکستان بنایا ہے اور

وہی حفاظت کرے گا ان شاء اللہ۔ جب حفاظت کے ذمہ داری اسی کی ہے تو کیوں فکر مند ہوں۔ دعائیں ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ صرف دعاؤں پر ہی ہمیں اختیار ہے اور اپنے اس اختیار سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آنچل پسند کرنے کا شکریہ۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ حافظہ ہیں اور سائنس کی طالبہ بھی۔ دعاؤں کے لیے اللہ سبحان وتعالیٰ سے اجر مانگتے ہیں آپ کے لیے۔

**سحرش خان...... حیدر آباد**

ڈیئر سحرش! سدا شاد رہو، محبت بھرا خط ملا۔ بہت عرصہ گزرا ہم موضوع دے کر افسانے لکھوایا کرتے تھے۔ نئی لکھنے والی بہنوں سے جو سب سے اچھا ہوتا تھا چھاپ دیتے تھے۔ معذرت اب اس کی گنجائش نہیں۔ آپ کی دعاؤں نے متاثر کیا اللہ سبحان وتعالیٰ آپ کی تمام دعا قبول فرمائے کہ آپ کا آنچل پوری دنیا میں مقبول اور منفرد مقام حاصل کرے آمین۔

**صباحت...... مظفر آباد**

پیاری صباحت! سدا جیتی رہو، طویل عرصہ بعد آپ کا خط ملا۔ ہم صباحت لکھنے کے عادی تھے اور آپ کے شہر کا نام بھی۔ اللہ سبحان وتعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کی زندگی کسی حد تک معمول پر آ گئی ہے آپ سے معذرت کے ساتھ کہ ہم موبائل پر بات نہیں کرتے۔ "در حجاب آں" کا سلسلہ اسی لیے شروع کیا تھا کہ بہنیں اپنے خطوط کے ذریعے رابطہ رکھ سکیں، اس طرح آدھی ملاقات تو ہو جاتی ہے ناں، یہی کافی ہے۔ ہم آپ کے لیے بہت سی دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ سبحان وتعالیٰ قبول فرمائے گا آمین۔

**ملیحہ عدنان...... گجرات**

ڈیئر ملیحہ! سدا شاد رہو آپ کا نام پڑھا نہیں گیا آئندہ صاف صاف لکھیے گا۔ خوشی ہوئی کہ آپ کی پڑھائی مکمل ہو گئی ہیں۔ تھوڑا انتظار اور کر لیجیے اپنی کہانی کا ورنہ دوسرا لکھ کر بھیج دیجیے۔ ہم سب کی طرف سے آپ کے لیے عافیت کی دعا۔

**ریحانہ مصطفیٰ...... ملتان**

ڈیئر ریحانہ! بے شمار دعائیں، مصنفین سے رابطہ خطوط کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ "دوست کا پیغام آئے" یہ کالم اسی کام کے لیے ہے۔ جس کے نام چاہیں خط لکھ سکتی ہیں مگر مختصر کیا کریں

ٹائٹل جس طرح کے ہوتے ہیں، وہی چھاپنا مجبوری ہے۔ ماڈل دلہن کے روپ میں ہی تصاویر بنواتی ہیں۔ بیوٹی پارلر کا شعبہ ہے ناں کبھی گہرے رنگ، کبھی ہلکے رنگ، پسند اپنی اپنی۔ کچھ بہنوں کو یہی گہرے رنگ پسند ہوتے ہیں۔

**تسلیم چوہدری...... میرپور آزاد کشمیر**

ڈیئر تسلیم! سدا خوش رہو، ٹائٹل کا جواب اوپر دے چکے ہیں اسے پڑھ لیجیے۔ کاغذ کا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بازار میں جس طرح کا بھی دستیاب ہوتا ہے وہی حاصل کیا جا رہا ہے۔ آنچل کی تیاری کے لیے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر ماہ تو کوئی بھی چیز نہیں چھپ سکتی۔ البتہ بہت معیاری چیزوں کو فوراً جگہ مل جاتی ہے۔ یہ شعبوں کی اپنی پسند پر منحصر ہوتا ہے۔ امید ہے تشفی ہو گئی ہوگی۔

**گل مہرو...... کراچی**

ڈیئر گل! سدا شاد رہو، پہلا خط ملا خوشی ہوئی۔ آپ کی تمام چیزیں بھیج دی جائیں گی ان کے شعبوں کو اور کوئی حکم کیجیے؟ لیجیے آگاہ کر دیا۔ اللہ سبحان وتعالیٰ آپ کو ہر قسم کے تمام امتحانوں میں کامیاب کرے آمین۔

**نادیہ رضوی...... گوجر خان**

ڈیئر نادیہ! سدا سہاگن رہو، آپ آنچل پرانا پڑھنے والی ہیں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی اور آپ نے آنچل سے جو کچھ بھی سیکھا اسے اپنی عملی زندگی میں عمل میں لا رہی ہیں اور ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہیں اور اپنے بچوں کی تربیت بھی انہیں خطوط پر کر رہی ہیں۔ ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ سبحان وتعالیٰ آپ کو سدا کامیاب رکھے آمین۔

**نگزش اسد...... پشاور**

ڈیئر نادیہ! ڈھیر سارا پیار، دعائیں پیارا سا پہلا خط ملا۔ خوشی ہوئی اور اس بات کا علم ہوا کہ ابھی سے آپ کو شاعری سے دلچسپی شروع ہو گئی ہے جب کہ آپ درجہ ہفتم کی طالبہ ہیں۔ آپ کے والد بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ آپ کو شاعری سے قدرتی طور پر لگاؤ ہونا چاہیے۔ بہت سا پڑھیے گا۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی رہیے گا۔ ہم دعا کرتے رہیں گے۔

**عائشہ حسین...... لاہور**

ڈیئر عائشہ! سلامت رہو، بہت پاکیزہ سا خط مل گیا۔ اللہ



سبحان وتعالیٰ شادی مبارک کرے۔ خوش قسمت ہیں کہ مدینہ منورہ میں شادی ہوئی۔ جب جب ان مقدس جالیوں کو ہاتھ لگائیں ہمارے لیے ایمان اور صحت کی دعا کیجیے گا۔ آپ کی نظم جو ہمارے نام سے لکھی گئی ہے اسے ان شاء اللہ جلد چھاپ دیں گے۔ اس ماہ کا سب کام تیار ہو کر چلا گیا ہے۔ کتابوں کا انتظار کریں گے اور پڑھیں گے بھی ضرور۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو مدینہ منورہ میں بہت خوش و خرم اور آباد رکھے اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ آمین۔

**ناقابل اشاعت کہانیاں**

چکی کے دو پاٹ، جیت، پہلا قدم، محافظ، چند پل آسمان کا سفر، تیرے دل میں لمحہ دل، بنت حوا کی روشنی، پھر عید آ گئی، گھر کا بھیدی، میرے ہمنوا، لمحہ محبت، دل تیرے دل سے، فلسفہ حیات، بیٹا، بڑی آپا قربانی، بزرگ کی دعا، زندگی گزاریں کے، زندگی درانی، فیصلہ، ترستا ارمان، مہنگا پیار، تم ہو جیتے ہوئے بکرے میاں، ہم ہارے ہوئے، جھوٹی محبت۔

**قابل اشاعت کہانیاں**

مات، چور راستہ، حق مہر، دھوکا، میں تمہارا، بدیع الجمال، دوہری زندگی، کن، گیلی مٹی کفارہ، بھٹکا دل، تیری چاہ میں، آگ جیون کو لگا دی، ہم نے محبت سرائے جنوں نہیں، ہم کہ مشعل چراغ راہ، اعتبار کا موسم، بڑا گھر، دیوانگان محرم، من مرضیاں، بہار رت، پریستان، اونچے محل کی شہزادی، یک شد نہ چار شد، آنگن کا پھول، تجھ سنگ نیناں لاگے، دل داغ دار، میرا گیت امر کر دو، درانی۔



**مصنفین سے گزارش**

☆ مسودہ صاف خوش خط لکھیں۔ حاشیہ لگائیں صفحہ کی ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں اور اس کی فوٹو کاپی کرا کر اپنے پاس رکھیں۔
☆ قسط وار ناول لکھنے کے لیے ادارہ سے اجازت حاصل کرنا لازمی ہے۔
☆ نئی لکھاری بہنیں کوشش کریں پہلے افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ پر طبع آزمائی کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ادارہ نے ناقابل اشاعت تحریروں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔
☆ مسودے کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخری صفحہ پر اپنا مکمل نام پتا اور رابطہ نمبر خوشخط تحریر کریں۔
☆ کہانی ای میل کرنے کے لیے ان پیج کی فائل ہو یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں اردو میں لکھیں تحریر ہونی چاہیے یا یونی کوڈ پر ہو۔ کہانی کے نام سے فائل کا نام رکھنا ہوگا۔ کہانی کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخر میں اپنا پورا نام مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی لکھنا ہوگا۔
☆ ای میل چاہے کہانی کی کرنی ہو یا مستقل سلسلوں میں ہمیشہ نئی ای میل کا انتخاب کریں اور سبجیکٹ میں کہانی اور سلسلے کا نام لکھیں۔ جوابی میل پر کچھ بھی ای میل نا کریں اگر جوابی میل پر کچھ بھی ای میل کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ editor_aa@naeyufaq.com
☆ ای میل پر کہانی یا مستقل سلسلے میں شرکت کے لیے اسکین امیجز رومن یا پی ڈی ایف قابل قبول نہیں ہوتی۔
☆ دیگر سوشل ایپ پر بھی کہانی یا سلسلوں کی کوئی بھی چیز قابل قبول نہیں ہوگی۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک یا کوریئر کے ذریعے ارسال کیجیے۔ بنگلو نمبر B1، مدینہ اسٹریٹ، بالمقابل انٹربورڈ آفس، نارتھ ناظم آباد بلاک A، کراچی 74700

# دانش کدہ

## سورۃ القدر

مشتاق احمد قریشی

ترجمہ:۔ یہ سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے اور فجر کے طلوع ہونے تک (رہتی ہے) (القدر۔۵)

یہ رات اس لیے سلامتی والی ہے کہ اس میں کوئی شر نہیں یا اس معنی میں سلامتی والی رات ہے کہ مومن اس
ت کو شیطان کے شر سے محفوظ رہتے ہیں یا فرشتے اہل ایمان کو سلام عرض کرتے ہیں اور یہ بھی کہ فرشتے بھی
ں میں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ مفسرین نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کی عبادت اور
ں خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے افضل ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے
نکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل اور عباوات کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ایک حدیث
ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص شب قدر
ں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف
گئے۔'' (بخاری و مسلم) ایک اور حدیث حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم
ں اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے جو شخص ان کے اجر کی طلب میں
دت میں کھڑا رہا اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کردے گا۔'' جبکہ اس سورۃ کی آیت نمبر۳ میں ارشاد
رہا ہے کہ شب قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ''شب قدر ہزار
ینوں سے بہتر ہے۔'' اور ہزار مہینوں سے مراد گنتی کے ۸۳ سال چار مہینے نہیں ہیں بلکہ اہل عرب کا یہ قاعدہ تھا کہ
ب وہ کسی بڑی کثیر تعداد کا تصور کرتے یا لاتے تو اس کے لیے وہ ہزار کا لفظ بولا کرتے تھے۔ یقیناً یہ رات بڑی
ں قدر و منزلت والی رات ہے ایسی عظیم الشان رات جس میں اللہ کے حکم سے اپنے حضور کھڑے عاجزی
انکساری اور بندگی کا اظہار کرنے والوں پر اس عظیم رات میں حضرت جبرائیل علیہ السلام جو اللہ کے خاص اور
مقرب فرشتے ہیں کی سربراہی میں فرشتوں کی ایک بڑی جماعت یا فوج زمین پر ان عبادت میں کھڑے بندوں کو
سلام پیش کرنے اترتی ہے اور طلوع فجر تک وہ مسلسل اللہ کے ان نیک بندوں پر جو اپنے رب کے حضور کھڑے
اپنی بندگی کا اظہار کررہے ہوتے ہیں کے لیے سلامتی کی دعائیں کرتی ہے ان پر سلام در سلام بھیجتی رہتی ہے۔ اللہ
اکبر اللہ کتنا مہربان اور رحم کرنے والا ہے وہ مالک اپنے بندوں سے کس قدر شفقت و محبت کا معاملہ فرماتا ہے۔

سلم کے لغوی معنی ہیں اس نے حفاظت کی۔ اور سلام کے معنی ہیں سلامتی دعا' سلام' امان' سالم اللہ تبارک
وتعالیٰ کا صفاتی نام۔ دارالسلام جنت کا ایک نام کیونکہ جنت میں داخل ہوکر اہلِ جنت تمام تکلیفوں' برائیوں'
پریشانیوں' عیبوں' دشمنیوں اور عداوتوں سے محفوظ و سلامت ہوجائیں گے۔ اس لیے بھی کہ تمام اہل جنت آپس
میں ایک دوسرے کو سلام سلام بار بار کہتے رہیں گے۔ خود باری تعالیٰ اور فرشتے بھی اہل جنت کو سلام کرتے رہیں
گے۔ یوں تو سلام کے متعدد معنی ہیں' براءت متارکہ (ترک جنگ یا صلح' میانہ روی و اعتدال' امن و عافیت' کمال



یعنی کامل و سالم ہونا۔ بقا' نجات' صحت' دعا اور درود' تبریک و تحیت یا کورنش (لسان العرب اور تاج العروس)

قرآن کریم میں یہ لفظ ۳۵ آیات تنکیر (سلام) اور تعریف (السلام) دو شکلوں میں مختلف معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تحیتہ کے لیے سورۂ یونس میں اس طرح آیا ہے۔

ترجمہ:۔ ان کی باہمی دعا یہ ہوگی ''السلام علیکم'' (یونس۔۱۰)

اہل جنت اللہ کی حمد و تسبیح میں ہر وقت رطب اللسان رہیں گے۔ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ ''اہل جنت کی زبانوں پر تسبیح و تحمید کا اس طرح الہام ہوگا جس طرح سانس کا الہام کیا جاتا ہے۔'' (صحیح مسلم) یعنی جس طرح بے اختیار سانس کی آمد و رفت رہتی ہے' اسی طرح اہلِ جنت ایک دوسرے کو لفظ سلام سے تحیتہ پیش کریں گے۔

دراصل جو اہلِ ایمان بندے دنیا میں جو ایک امتحان گاہ کی حیثیت رکھتی ہے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گزار کر اپنی دنیا کی زندگی میں اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا لیتے ہیں۔ وہی لوگ جب دنیا کے پاکیزہ ماحول سے مختلف جنت کے پاکیزہ ترین ماحول میں جائیں گے تو ان کی سیرت و کردار زیادہ نکھر کر ابھر آئیں گی ان کا محبوب ترین مشغلہ اللہ کی حمد و ثنا ہوگا جس سے دنیا میں بھی وہ خوب مانوس رہے تھے وہ ایک دوسرے کی سلامتی کا جذبہ دنیا میں بھی رکھتے تھے جنت میں بھی وہ ایک دوسرے کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہیں گے۔

سورۃ الرعد میں تبریک یا خوش آمدید کے طور پر یہ لفظ سلام استعمال ہوا ہے۔

ترجمہ:۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو' صبر کے بدلے' کیا ہی اچھا (بدلہ) ہے اس دار آخرت کا۔ (الرعد۔۲۴)

دنیا میں احکام الٰہی اور نبی آخرالزماں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے والوں کا جنت میں داخل ہونے پر فرشتے استقبال کریں گے تو انہیں ہدیہ تبریک پیش کریں گے اور انہیں خوش آمدید کہیں گے اور انہیں سلام پیش کریں گے وہ کہیں گے تم پر سلام ہو کہ تم نے صبر کیا' اب آخرت کا یہ گھر تمہارے لیے بہت ہی عمدہ گھر ہوگا۔ امن و سلامتی کے معنی جیسے سورۃ القدر کی زیرِ تشریح آیت میں ارشاد ہوا ہے یعنی یہ امن و سلامتی طلوع فجر تک رہتی ہے اور پاکیزہ باتیں جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں ارشاد ہوا ہے۔

ترجمہ:۔ (اہل جنت) نہ وہاں کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گناہ کی بات (خلافِ تہذیب) ہر طرف سلام ہی سلام کی آوازیں آرہی ہوں گی۔ (الواقعہ۔۲۵۔۲۶)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بڑی بڑی نعمتوں کا اہتمام و انتظام فرمایا ہے دنیا میں بھی اور آخرت کی دائمی زندگی کے لیے بھی اہلِ ایمان بندوں کی ترغیب و توجہ کے لیے وہ اپنی نعمتوں کو بار بار کھول کھول کر قرآن مجید میں بتا رہا ہے۔ آیت کریمہ میں بھی جنت کا بڑا ذکر فرمایا گیا ہے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اسے دہرایا بھی گیا ہے کہ انسان جنت میں نہ کوئی بے ہودہ بات کرے گا نہ ہی کسی سے سنے گا نہ خود جھوٹ بولے گا نہ غیبت کرے گا نہ بہتان یا گالی کسی کو دے گا نہ طنز و تمسخر کرے گا نہ کوئی اور کرسکے گا۔ نہ کسی سے کسی بھی طرح کا طعنہ و تشنیع سنے گا نہ کسی کو کچھ کہے گا غرض جنت ایک پاکیزہ صاف شفاف قلب لوگوں کی سوسائٹی ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ سلامتی اور محبت سے رہیں گے وہ ایک مہذب معاشرہ جہاں ہر طرف ہر کوئی انتہائی مہذب بااخلاق اور پاکیزہ فطرت پر زندگی بسر کرنے والا ہوگا۔ دنیا کی زندگی کی تمام بدتہذیبی بداخلاقی جو

ارادے کا وہ محدود اختیار جو دنیا میں حاصل تھا وہ ختم ہو چکا ہوگا۔ وہ دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ جو بداعمالی انسان کو ملنے والے ارادے کے محدود اختیار کا غلط استعمال کے باعث تھی وہ ختم ہو جائے گی کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جنت کی عظیم ترین زندگی میں دنیا کے تمام عذابوں سے نجات کی خوش خبری دی ہے۔ جنت کو اللہ تعالیٰ نے سلامتی کا گھر قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ یونس میں ارشادِ الٰہی ہوا ہے۔

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف تمہیں بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ (یونس۔۲۵)

ہم جس زمین جس دنیا میں رہتے ہیں اس کی ہر چیز مٹ جانے والی ہے ختم ہو جانے والی ہے اس کی کسی بھی چیز کو بقا نہیں ہے۔ انسان اس کی ناپائیداری کو دیکھتا بھی ہے سمجھتا بھی ہے ہر روز ہر طرف ہزاروں لوگوں کو مختلف چیزوں کو اپنی آنکھوں سے مٹتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھتا ہے پھر بھی اس کے فریب میں گرفتار رہتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جو ہمارا مالک وخالق ہے وہ ہمیں اس ناپائیدار زندگی کے فریب سے نکال کر دعوت دے رہا ہے دارالسلام کی طرف بلا رہا ہے کہ اے اہلِ ایمان بندو آؤ میں نے تمہارے لیے جنت سجا رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی فلاح وبھلائی کے لیے بار بار ان کی ہدایات ورہنمائی کے لیے اپنے منتخب نمائندے پیغمبر رسول بھیجے تاکہ دنیا کی حرص وہوس میں مبتلا ہو جانے والوں کو شیطان کے چنگل سے نکلنے کی راہ دکھادی جائے۔ انہیں بتا دیا جائے سمجھا دیا جائے کہ یہ دنیا کی زندگی تو عارضی اور ختم ہو جانے والی ہے یہاں کیے گئے اعمال ہی ہمارا سرمایہ حیات دائمی ہوں گے یہاں کی زندگی ہی فیصلہ کرے گی کہ انسان نفع کا سودا کرتا ہے یا پھر خسارے سے دوچار ہوتا ہے۔ دنیا کی سرسبزی وشادابی انسان کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ زندگی بس اس دنیا تک ہی محدود ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں جبکہ اس کا رب اس کا خالق اسے قدم قدم پر رہنمائی فراہم کر رہا ہوتا ہے اور سمجھا رہا ہوتا ہے کہ یہ دنیا جو چشم زدن میں فنا کے گھاٹ اترنے والی ہے سب کچھ ختم ہونے والا ہے باقی رہنے والے صرف تمہارے اس دنیا میں کیے ہوئے اعمال ہی ہوں گے جو تمہیں تمہاری دائمی اور آخرت کی زندگی سے دوچار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کو دارالسلام کی طرف بلا رہا ہے جو سراسر سلامتی اور امن والا گھر ہے جہاں انسان کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ جنت الفردوس انسان اپنے اعمال صالحہ سے ہی حاصل کر سکے گا۔ سلام درود کے معنی میں بھی آیا ہے جیسے سورۃ الصفت میں ارشاد ہوا ہے۔

ترجمہ:۔ پیغمبروں پر سلام۔ (الصفت۔۱۸۱)

تمام پیغمبر جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے منتخب بندے ہوتے ہیں وہ اہل دنیا تک نہ صرف پیغام الٰہی پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں بلکہ اللہ کے بندوں کی عملی تربیت وتعلیم بھی کرتے ہیں اور خود کامل نمونہ بن کر اہلِ ایمان کو سمجھاتے ہیں کہ کس طرح دنیا کی زندگی بسر کرنی ہے جس کے بہتر نتیجے کے طور پر انہیں آخرت کی دائمی زندگی کی راحتیں نعمتیں حاصل ہو سکیں گی اور کیا کچھ نہیں کرنا اور اگر احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی اور کفر کی راہ اختیار کی تو کیسے کیسے بھیانک عذابوں سے پالا پڑے گا۔ پیغمبر چونکہ احکامِ الٰہی کو بالکل اس ہی طرح پہنچا دیتے ہیں جس طرح ان کو پہنچانے کا حکم اللہ انہیں دیتا ہے وہ سب کے سب اور خصوصاً نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً سلام وتبریک کے مستحق ہیں۔ سلامتی اس کے لیے ہی ہے جس نے احکامِ الٰہی کو تسلیم کیا اور اللہ تعالیٰ کے آگے سر تسلیم خم کیا۔



احادیث میں شب قدر کا نہایت تفصیل اور وضاحت سے ذکر آیا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے ”تمہارے اوپر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے جو شخص اس رات سے محروم ہوگیا وہ ساری خیر سے محروم ہوگیا اور اس کی بھلائی سے محروم نہیں رہتا مگر وہی جو واقعی محروم ہوا۔ ایک اور حدیث شریف میں یوں آیا ہے کہ ”لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں اور اس شخص کے لیے جو کھڑے یا بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر بذیل سورۃ القدر۔ زکریا کاندھلوی۔ فضائل رمضان)

لیلۃ القدر یا شب قدر کے سلسلے میں چند باتیں نہایت اہم ہیں اس کے بارے میں تقریباً چالیس منتخب اقوال پائے جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن) چند بڑے بڑے مسالک کے مطابق شب قدر رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے ہر سال مختلف موقع پر بدلتی رہتی ہے پورے رمضان میں ہوتی ہے اور رمضان کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ (تفسیر البیضاوی) ان تمام اقوال میں بنیادی بات یہ سامنے آتی ہے۔ پہلی یہ کہ یہ رات ہر سال رمضان شریف کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ رات پورے سال پر محیط ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اصرار تھا کہ یہ رات پورے سال گردش کرتی رہتی ہے۔ مگر صحابہ کرام کی اکثریت کی رائے اس کے خلاف تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے پر یوں اظہار خیال فرماتے ہیں۔ ”اللہ ابوعبدالرحمٰن پر رحم فرمائے بے شک انہیں معلوم تھا کہ وہ رات (شب قدر) رمضان المبارک ہی کی رات ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائیں (ابن کثیر) جمہور کا مسلک یہ ہے کہ یہ رات رمضان شریف ہی میں ہوتی ہے اس کی تائید قرآن حکیم کی اندرونی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت۔۱۸۵ میں ارشاد ہوا ہے (ترجمہ) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور (جس میں) واضح نشانیاں ہیں۔“ اسی طرح سورۃ القدر اور دیگر آیات الٰہی میں بھی اسے واضح کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قول کے مطابق یہ ایک نہیں دو راتیں ہوتی ہیں ایک رات ہمیشہ رمضان المبارک میں ہی آتی ہے جس کا ذکر سورۃ القدر میں کیا گیا ہے اور دوسری رات جس کا ذکر سورۃ الدخان میں کیا گیا ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کیے جاتے ہیں وہ پورے سال میں گردش کرتی رہتی ہے۔ آگے وہ تحریر کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کا نزول ہوا تو اس وقت ان دونوں راتوں کو ایک ہی رات میں جمع کر دیا گیا۔ (حجۃ اللہ البالغہ۔ اردو ترجمہ)

بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین رحیم اللہ کے قول کے مطابق شب قدر رمضان کریم کی سترھویں (۱۷) شب ہوتی ہے کیونکہ اسی رات کی صبح کو غزوہ بدر پیش آیا تھا۔ جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوم الفرقان کا نام دیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ انفال میں ارشاد ربانی ہوا ہے۔

(جاری ہے)

# ہمسائے آنچل

## نجمہ جبار

پیاری آنچل بہنوں صفحہ پلٹنے سے پہلے آئیں مجھ سے ملیں کہ میں نجمہ جبار ہوں اور میرا تعلق پنجاب کے خوبصورت شہر بہاولپور سے ہے۔ میرے ماشاء اللہ چھ بھائی اور ہم چار بہنیں ہیں۔ میرے تین بچے آریان، ارمغان اور اشمل میری جنت ہیں۔ دو ہزار پانچ میں شادی ہوئی اور شروع سے ہی پڑھنے کا شوق تھا اور میں خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ جہاں میکے والوں نے کبھی ڈائجسٹ اور خاص کر آنچل پڑھنے پر اعتراض نہیں کیا وہیں میرے شوہر ارشد اور میرے ساس سسر بھی شادی کے بعد میرے اس شوق کی رکاوٹ نہیں بنے یہاں تک کہ اپنے شوہر اور تمام میکے وسسرال والوں کی حوصلہ افزائی پر یوٹیوب پر بلائنڈ خواتین کے لیے نوولز کا چینل بنایا اور جو ڈائجسٹ نہیں پڑھ سکتیں وہ چینل پر رائٹرز کی دلچسپ وسبق آموز تحریریں پڑھ لیتی ہیں۔ میں دس سال درس وتدریس کے شعبے سے بھی وابستہ رہی اور ساتھ آنچل کو بھی پڑھتی رہی۔ مجھے شاعری سے بہت لگاؤ ہے شروع سے تو میں شاعری بھی کرتی رہی ہوں اور ہاں شادی سے پہلے ایک بار شاعرہ ورائٹر سیما سراج سے بھی ملاقات ہوئی۔ اپنے بڑے بھائی احسان جو کہ جاسوسی کے شیدائی تھے ان کی دیکھا دیکھی میں انیس سو اناسی سے دیگر رسائل کے ساتھ خاص طور پر آنچل ڈائجسٹ کو پڑھ رہی ہوں جس طرح اس وقت آپ مجھے پڑھ رہی ہیں۔ آنچل سے اتنی طویل رفاقت ہے تو یہ مجھے اپنی فیملی کی طرح لگتا ہے اور ہر ماہ اس کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ آنچل میں در جواب آں، آئینہ، دوست کا پیغام، نیرنگ خیال وڈش مقابلہ میرے پسندیدہ ہیں اور ہاں پہلے کافی آنچل میں غزل اس نے چھیڑی اور آپ کی شخصیت بھی سلسلہ تھا کاش وہ پھر شروع ہو۔ پسندیدہ شخصیت نبی ﷺ ہیں۔ کھانے میں سب چیزیں شوق سے کھالیتی ہوں ہاں مگر اروی کے پتے، قیمہ، کریلے، ساگ، کڑھی، کھنڈیاں، ہر قسم کے گوشت کا سالن اور چاول۔ میٹھے میں مالٹائی زردہ، چنے اور دال کا حلوہ اور سوہن حلوہ، گاجر کا حلوہ، کیک اور مٹھائی بہت پسند ہیں۔ بچپن کی یادیں بہت یاد آتی ہیں جب ایک روپیہ عیدی ملنے پر اتنی خوشی ہوتی تھی اور گلی میں سب مل کر برف پانی واسٹاپو کھیلتے تھے تو کبھی میں کیریاں جو کہ شروع سے مجھے پسند ہیں اور ام چور کے ساتھ کھاتی تھی وہ بھی اپنی دوستوں کے ساتھ بنا اجازت کسی کے درخت پر چڑھ کر تو کبھی لوگوں کے گھر کی گھنٹی بجا کر بھاگ جاتی تھی اور پکڑے جانے پر ڈانٹ اور مار پڑی تھوڑی سی۔ ریاضی سے نفرت تھی۔ خامی یہ ہے کہ کچھ جلد باز ہوں تو خوبی یہ ہے کہ ملنسار ہوں۔ پسندیدہ جگہ مکہ ومدینہ ہے اور میری شدید خواہش ہے کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ اس مقدس سرزمین کی طرف جاؤں۔ بارش کے بعد مٹی اور گلاب کی خوشبو بڑی پسند ہے وہیں سردی کا موسم بہت لطف دیتا ہے۔ پسندیدہ رائٹرز کی بات کی جائے تو آنچل کی تمام ہی میری پسندیدہ ہیں یعنی نگہت سیما، راحت وفا، شاہینہ چندہ مہتاب، اقرأ صغیر احمد، رخ چودھری، نازیہ کنول نازی، نادیہ احمد، نادیہ فاطمہ رضوی، سمیرا شریف طور، عشنا کوثر تو نئے لکھنے والوں میں بشریٰ سیال، ام ایمان قاضی، حنا بشریٰ، سعدیہ امل، سیدہ غزل زیدی، سباس گل، کوثر ناز، فرح بھٹو، سارہ ناصر، انعم توصیف، مسکان نور، فاطمہ عاشی، حوریہ بتول، ام زویا، مہوش اسد شیخ، نجل سعدی آرائیں، تمیرا علی۔ آنچل کی تمام ایڈیٹرز وہ پہلی زریں قمر، سلمیٰ کنول، فرحت آرا ہو یا قیصرہ آرا ہو سب نے اچھے سے اس ڈائجسٹ کو بنایا۔ جہاں سعیدہ نثار، شائلہ کاشف، ایمان وقار، روبین احمد، شہلا عامر میری اپنی ہیں وہیں آنچل کی تمام تبصرہ نگار اور پوری دنیا میں آنچل کی پڑھنے والیاں چاہے وہ آنچل میں شرکت کریں یا خاموش قاری ہوں تو ان سب سے اس آنچل کی وجہ سے بہت زیادہ اپنائیت ومحبت ہے اور یہ ادارے کی کامیابی تو ہے کہ ہم تمام جو آنچل سے منسلک ہیں یہ ان دیکھے ایک دوسرے کو دعاؤں میں جہاں یاد رکھتی ہیں وہیں خوشی غمی میں ایک دوسرے کی ساجھی ہیں۔ عید سے متعلق ایک واقعہ سناتی ہوں تو شادی سے پہلے کا اور میری چیخیں تو ویسے ہی مشہور ہوئیں سب میں تو اور اگر ہمارے میں اس قربانی کے (جانور) ویڑے کے بیچ وہ لوہے کا دروازہ نہ آتا تو میں اور میری بہنیں اس ضدی شیر کی طرح بپھرے ہوئی ویڑے کے نوکیلے سنگوں کے ساتھ اس کے جارحانہ انداز جمع ظالم تشدد کے نشانہ بن چکی ہوتیں۔ دراصل قربانی کا ویڑہ شاید نازیہ، اقرأ وسمیرا کے ناولز کے کچھ روکھے مزاج کے ہیروں کی طرح کچھ زیادہ ہی نکھریلا اور غصے والا تھا کالا تو اسا جو قربان ہونا نہیں چاہتا تھا تو جیسے ہی ذبح کے لیے لٹایا تو ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا شاید میرے بھائیوں اور ساتھ کے لوگوں کی گرفت مضبوط نہ تھی اور ایک ٹوکر مارتے ہوئے کمرے کی طرف آیا جس کی کھڑکی سے میں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی اور میں نے تو اس بات پر اتنی چیخیں ماریں کہ نہ پوچھیں اور ساتھ میری بہنوں نے بھی خیر دراوزہ بند تھا مگر پھر بھی ڈر تو تھا ہی میں سہم گئی تھی کہ حساس طبیعت ہے۔ جب کمرے میں نہ جاسکا تو باہر کے گیٹ کھلا ہونے کی وجہ سے گھر سے باہر نکل گیا اور بھاگ گیا اور پھر گھر کے مرد اس کے پیچھے پیچھے جیسے گنگنا رہے ہوں کہ "ہم تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے" خیر محلے کے لوگوں نے بہت مشکل سے موصوف کو قابو کیا اور پھر دوبارہ اس کو گھر لایا گیا جیسے قیدی کو جیل میں لایا جاتا ہے اور سب مرد حضرت کے بہت زیادہ کس کر پکڑنے کے بعد ذبح کیا مگر یہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا اور اکثر یاد آتا ہے تو سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں نجمہ کیسے چیخیں مار رہی تھی جیسے وہ جانور مجھے ٹکریں مار رہا ہو اور میں بھی ہنستی ہوں اس واقعے پر۔ ایک بار پھر سے میری طرف سے آنچل والوں کو بکرا، اونٹ، ویڑہ عید مبارک بھی ہو۔

تو پیاری قارئین آنچل بتائیں مجھ سے مل کر کیسا لگا؟ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ آپ تمام جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور دونوں جہاں میں سرخرو، آمین۔

انہیں چھلنی کر گیا۔

"خدا بخس۔ دھیرے بھاگے سو۔ ہمار پیر رپٹ گئیو نا اور ہم گر گئے نا تو میا ہم کا دو چمات دھرے گی۔ رک سے خدا بخس۔" خدا بخش نے ہنستے ہوئے پلٹ کے دیپو کو دیکھا۔ وہ لڑھکتا اور بری طرح ہانپتا اس کے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا۔

دونوں پرانے مندر کی کھوئی کے پاس سے دوڑنا شروع ہوئے تھے۔ خدا بخش اس سے آگے نکل گیا تھا اور اسے خیال تک نا رہا کہ دیپو کو دمے کا دورہ پڑ سکتا تھا۔ وہ خدا بخش کے ساتھ کھیلنے کے لیے اپنا جیون بھی تیاگ سکتا تھا۔ کچھ ایسا ہی رسیا تھا وہ اس کا۔ دیپو کو یوں بے حال ہوتا دیکھ وہ بری طرح گھبرا کے رکا اور واپس اس کی سمت دوڑ لگائی تھی۔ جب تک اس کے قریب پہنچتا، وہ کھانسنا شروع کر چکا تھا۔ خدا بخش کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ پریشانی سے اس کی کمر سہلانے لگا۔ وہیں پرانے پیپل کے نیچے اس کی کمر ٹکا کے ہاتھ پیر ملنے لگا اگر دیپو کو کچھ ہو جاتا تو اس کا باپ کرپا شنکر اسے زندہ جلا ڈالتا۔ خدا بخش کی آنکھیں بھر آئیں۔ دیپو کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ وہ موندی موندی آنکھیں کھول کر خدا بخش کو تسلی دینے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سانس ہموار ہوتی تو وہ کچھ کہہ پاتا۔ خدا بخش نے سوچا کہ وہ بھاگ کر جائے اور حکیم چاچا کو بلا لائے۔ شاید اس کے ننھے دل کا خوف حکیم چاچا کے دل میں الہام بن کے اترا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی سی صندوقچی پکڑے وہاں آتے دکھے۔ دونوں کو یوں حال و بے حال دیکھ کے وہ فوراً سمجھ گئے کہ دیپک لال کو دمے کا دورہ پڑا ہے۔ انہوں نے تادیبی نگاہوں سے خدا بخش کو دیکھا اور فوراً صندوقچی کھول کر اس میں سے مطلوبہ دوا ڈھونڈنے لگے۔ خدا بخش سر نیہوڑائے دل ہی دل میں اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ دیپو بچ جائے۔ اس نے تب تک آنکھیں کھولیں نا سر اٹھایا جب تک حکیم چاچا نے اس کا کندھا پکڑ کے جھنجھوڑ نہیں ڈالا تھا۔

"چل لے جا اب اسے اس کی حویلی۔ شکر کر ہلکا سا دورہ تھا ورنہ آج تھے (تو نے) اپنے سب گھر والوں کی لٹیا ڈبو دی تھی سمجھ۔ پتا نہیں کائیں (کیا) اس کے باپ کا۔ چل اٹھ جلدی کر۔" اور خدا بخش کسی قیمتی متاع کی طرح دیپو کو اپنے ناتواں بازوؤں کا سہارا دیے اس کی حویلی کی جانب چل پڑا۔ گاؤں کی تیسری بڑی حویلی۔ جس کے اونچے چوبارے اور چار مینار دور سے ہی دکھائی دینے لگتے تھے۔

یہ حویلی گاؤں کے سنار کرپا شنکر کی تھی۔ جو اپنے پیسے اور کروفر کی بدولت سارے گاؤں میں مشہور تھا۔ دیپک لال اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو تقریباً اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس کے "ونش" کا اکلوتا پھول۔ دیپک لال کی پیدائش پر تین ماہ حویلی میں دیگیں چڑھی رہی تھیں اور سارا گاؤں وہاں سے کھاتا رہا تھا۔ دیپک کچھ بڑا ہوا تو کرپا شنکر کو معلوم ہوا کہ اسے دمے کا مرض ہے جو علاج معالجے سے بڑھنے سے رک سکتا تھا لیکن ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ اس وقت دمے کا حتمی علاج شاذ و نادر ہی کوئی کر پاتا تھا۔ دیپک کی ماں نے کلیجہ تھام لیا تھا اور دیپک کو جیسے خزانے کی طرح حویلی کے اندر چھپا ڈالا۔ دیپک کا نا کوئی دوست تھا نا بننے دیا جاتا کیونکہ وہ برہمن ہندو تھا اور کرپا شنکر اس معاملے میں انتہائی کٹر سوچ کا حامل تھا۔ ارد گرد زیادہ تر بچے جو ہندو تو تھے لیکن برہمن نہیں تھے ان کے ساتھ بھی دیپک کو کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمان بچے کا تو تصور ہی محال تھا کہ وہ دیپک لال کے ساتھ بیٹھ بھی سکے۔ دیپک حویلی کے چوباروں اور میناروں پہ چڑھ کر حسرت سے بچوں کو کچی پگڈنڈیوں پہ کھیلتے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی درختوں پہ چڑھتے تو کبھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور ایک دوسرے کو پکڑ کر لڑتے۔ لڑائی کے بعد ہونے والی صلح دیپک کو بے حد پسند تھی جو فوراً ہی ہو جایا کرتی۔ وہ بھی باہر جا کر کھیلنا چاہتا تھا لیکن اس کی مائی اور پتا اس معاملے میں نرمی نہیں برتتے تھے۔ ماں کو وہ راضی کر سکتا تھا پر اس کی مائی اس کے باپ کو منا نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک شدھ پتی ورتا قسم کی عورت تھی جو شوہر کے سامنے کبھی ہنسی بھی نا تھی۔ خدا بخش اسی گاؤں کے ایک غریب مسلمان گھرانے کا منجھلا بچہ تھا۔



جس سے دو بڑے اور تین چھوٹے بہن بھائی تھے اس لیے اس کی جانب کسی کا خاص دھیان نہیں تھا۔ وہ مدرسے جاتا اور وہاں سے نکل کر سارا دن کھیل کود میں گزار دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک بوری گڑوی بھری پڑی تھی کنچوں سے۔ ان سے وہ کھیلا کرتا اور کبھی سیر نا ہوتا۔ وہ زیادہ تر اکیلا اکھیلا کرتا ہے کیونکہ اکیلے وہ خود ہی ہار اور جیت کا مالک ہوتا تھا۔ دیپک لال سے اس کی دوستی بھی عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ خدا بخش کا باپ سکھ بیوپاری کا مقروض ہوا تو قرضہ اتارنے کی خاطر کرپا شنکر کے پاس آیا تھا۔ اس کے پھلوں کے باغات تھے جن کی راکھی خدا بخش کا باپ کیا کرتا تھا۔ بدلے میں اسے کچھ اناج اور کپڑا بھانڈا مل جایا کرتا تھا۔ پچھلے سال خدا بخش کا کچا مکان ایک طرف سے ڈھے گیا تو اس کے باپ نے قرضہ لیا تھا۔ قرضہ سود پر تھا اور سود اتارتے اتارتے خدا بخش کا باپ ادھ موا ہو گیا تھا تو قرض کی رقم کیسے اتر پاتی۔ سکھ بیوپاری جان کو آ گیا تھا۔ مجبور ہو کر خدا بخش کے باپ کو اپنے بڑے لڑکوں کو کام سے لگانا پڑا تھا۔ پہلے وہ اس کا ہاتھ تو بٹاتے تھے لیکن مکمل چاکری کسی کی نہیں کرتے تھے۔ اب جب سر پر پڑی تو خدا بخش کے باپ نے بڑے دونوں لڑکوں کو گاؤں کے سرپنچ کے ہاں ڈنگروں کی دیکھ بھال کے لیے اجرت پہ رکھوا دیا اور خود خدا بخش کو لیے کرپا شنکر سنار کے ہاں چلا آیا۔ قرضے کی رقم بہت زیادہ نہیں تھی لیکن غریب کے لیے بہت تھی ایسے میں کرپا شنکر نے ادھار دینے سے صاف منع کر دیا تھا۔ خدا بخش کا باپ جب اس کا ہاتھ تھامے واپس ہونے لگا تو کرپا شنکر نے آواز دے دی تھی۔

"اپنے چھورے کو کیوں نہیں لگا دیتا ایہو کام سے۔ باڑے کا کام دیکھت ہے اور ساتھ سو اندر باہر کے کام نکل ہی آوت ہیں۔ پگار طے کر لیجو جو بھی چل رہی۔ دھیرے دھیرے اتر ہی جاوے گا تیرا قرجا۔" اور خدا بخش کا باپ ٹھٹھک کے رک گیا تھا۔ خدا بخش نے اسے سہمی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ ان کا مفہوم سمجھ جائے اور نا اسے چھوڑ کے جائے یہاں لیکن اس کے باپ کے سامنے قرض کی رقم ناچ رہی تھی۔ قرض نا اترتا تو سکھ بیوپاری اس کے مکان پہ قبضہ کر لیتا۔ ایسے میں وہ بیوی بچوں کو کہاں لے جاتا۔ اس نے دھیرے سے خدا بخش کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ خدا بخش مزید سہم کے سکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی کنچوں سے بھری گڑوی گھوم گئی جو اس کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ خدا بخش کا باپ اسے تو حویلی میں چھوڑ گیا لیکن اس کی پگار یک مشت ہی لے گیا تاکہ قرضہ اتار سکے۔

اب خدا بخش حویلی کا بے دام غلام تھا۔ باپ چلا گیا تو وہ سہما سا ایک نکڑ پہ کھڑا ٹکر ٹکر دیکھنے لگا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے اور کام کیا کرنا ہے۔ کرپا شنکر بہت بڑی پلنگ نما چارپائی پہ کھاتے کھولے اپنے منشی سے گفتگو میں مصروف تھا اور جب کچھ فرصت ہوئی تو اسے دوسرے ملازم کے ہمراہ باڑے میں بھیج دیا۔ خدا بخش نو سال کا ننھا سا بچہ تھا۔ اسے اپنے باپ پہ بے حد دکھ ہو رہا تھا جو اس سے بنا پوچھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ تو اماں سے بھی صبح کا ملا ہوا تھا۔ ماں کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں گیلی ہونے لگی تھیں۔ وہ آستین سے آنکھیں پونچھتا ملازم کا بتایا کام کرنے لگا۔ ٹوکے سے چارہ کاٹتے، دودھ کے ڈول ڈھوتے اور ڈنگروں کی غلاظت کو دائرے میں ڈال کر پچھواڑے اپلوں کے لیے جمع کرتے اسے صبح سے شام ہو گئی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اپنے باپ کا منتظر تھا کہ وہ آئے گا اور اسے لے جائے گا۔ اس کی ماں ہی بھیج دے گی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ خدا بخش رات کو اکیلے میں ڈرتا ہے لیکن رات سر پہ آ گئی اور ایک ملازم اسے پتلی سی دری اور گندہ میلا سا کھیس دے گیا کہ وہیں باڑے کے ایک کونے پہ بچھا کے سو رہے۔ سارا دن اس کا ابکائیاں روک روک کے برا حشر ہو گیا تھا۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکا تھا کہ جی الٹ رہا تھا۔ بدبو اور گوبر جیسے اسے خود سے چمٹا محسوس ہو رہا تھا اور اب دری اور کھیس کی ھسک اور خراب حالت نے اس کا دل مالش کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں چیزیں ایک جانب رکھ کے خود دیوار سے کمر ٹیک کر پیروں کے بل بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دیے گھٹ گھٹ کے رونے لگا۔

باڑے میں ٹھنڈ تھی اور اندھیرا بھی۔ پورے چاند کی روشنی نے ہر شے کو ہیولے میں بدل دیا تھا۔ سب کچھ واضح دکھتا تھا۔ وہ روتا رہا اس بات سے بے خبر کہ چوبارے کی کھڑکی سے دیپک لال کب سے اسے ترحم سے دیکھ رہا تھا۔ دو بچے دو دل اور دو انتہا ئیں۔ ایک عسرت تو دوسری عشرت۔ ایک انتہائی غریبی تو دوسری انتہائی امارت لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب دیپک لال اور خدا بخش کے دل کا تار جڑا اور دونوں کی روحوں کا تعلق قائم ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

''چھوٹے دادا اور کتنا چلنا ہے یار۔ کچھ کھلا ہی دیں پہلے، آپ کی جنم بھومی میں آئے ہیں، کیا خاطر نہیں کریں گے؟'' ریان کب سے اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلتا تھک گیا تھا لیکن اس کے پیروں میں تو پہیل بندھے تھے۔ زمین پہ پڑتے ہی ناچتے اڑتے جارہے تھے جیسے۔ پوتے کی پکار پہ وہ مسکراتا ہوا رکا اور پلٹ کے دیکھتے ہوئے بولا۔

''طعنہ مار دیا ورنہ منزل پہ پہنچنے سے پہلے میں رکنے والا نہیں تھا۔'' اس نے اپنی پھولی سانسوں کو قابو کرتے ہوئے کہا اور اردگرد دکانوں پہ نگاہ دوڑانے لگا۔ وہ اس وقت بازار کے بیچ سے گزر رہے تھے۔ یہاں اس زمانے میں اکا دکا دکانیں ہوا کرتی تھیں اور اب جیسے وہ اپنے کنچوں کو مٹھی میں بھر کے فرش پہ اچھالا کرتا تھا، ویسے ہی کسی نے دکانوں کو جگہ جگہ پہ دانوں کی طرح بکھیر دیا تھا۔ یہیں حلوائی کی دکان ہوا کرتی تھی، چاچا کرم الٰہی نام تھا اس کا۔ اس کی دودھ جلیبی سارے گاؤں میں مشہور تھی۔ امرتیاں، بالو شاہیاں، بوندیاں اور پیٹھے کا حلوہ۔ منہ میں شیرینی گھل گئی اور آنکھ میں نمکینی۔ وہ اسے لیے ٹھیک اس جگہ پہنچا جہاں چاچا کرم الٰہی کی دکان تھی۔ وہاں اب ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا چائے ناشتے کے لیے، ساتھ ہی بیکری کی اشیاء رکھی تھیں۔ وہ دل کا ہوکا دباتے ہوئے باہر ترتیب سے لگے بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور ریان کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سر اٹھا کے سائن بورڈ کو دیکھا تو وہاں اب نام بدل چکا تھا۔ یہ کوئی اسلم فوڈ پوائنٹ تھا۔ اس نے حسرت زدہ سی سانس خارج کی اور یاسیت سے اس ویٹر نما لڑکے کو دیکھے گیا جو کندھے پہ ایک گندا سا رومال ہاتھ میں چھوٹا سا رائٹنگ پیڈ اور قلم تھامے اپنے تئیں اس سے مینیو پوچھنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ریان کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ کے آرڈر لکھوانے کا کہا اور خود ادھر ادھر نظریں دوڑاتا وہ مناظر تازہ کرنے لگا جو اب سے بہتر سال پہلے اس کی زندگی ہوا کرتے تھے۔

''ارے او راموکاکا...... ارے او رک تو سہی۔'' وہ اور دیپک لال، رام پرساد کے چھکڑے کے پیچھے بھاگے چلے آرہے تھے۔ اس نے دیپک کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ بالآخر راموکے چھکڑے تک پہنچ کر دونوں ایک جست میں اوپر کودے تھے۔ دو موٹے تازے بیل تھے راموکاکا کے اور وہ دونوں ہی انتظار کیا کرتے تھے کہ کب راموکاکا یہاں سے گزرے اور وہ ساتھ ہولیں۔ وہ پیچھے سے یکدم قلانچ مارتا آگے آدھمکتا تھا اور راموکاکا کے ہاتھ سے لگام تھام لیتا تھا۔ وہ پہلے منع کرتا رہتا پھر بالآخر اس کی ضد کے آگے ہار جاتا اور دیپک لال بس اس کو ہنستا دیکھ کے ہنسے جاتا۔ ایسا ہی دیوانہ تھا وہ خدا بخش کا۔ اس کا بس چلتا تو سارا سارا دن اسی سے چپکا گزار دیتا۔ دیپک کو خدا بخش کی شکل میں ایک دوست، ہمدرد، خیر خواہ اور رشتہ ملا تھا۔ وہ دیوانگی کی حد تک خدا بخش سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت سے پہلے اسے انسیت ہوئی تھی خدا بخش سے اور وہ اسی رات ہوگئی تھی جس رات باڑے کے یخ اور بدبودار ماحول میں اس نے خدا بخش کو پورے چاند کی روشنی میں روتے دیکھا تھا۔ وہ دبے پیر چوبارے سے اترا تھا اور ہاتھ میں لالٹین تھامے چوکس نگاہی سے ادھر ادھر دیکھتا باڑے کے پھاٹک پہ کھڑا کنڈا ٹٹول رہا تھا۔ ملازم جاتے ہوئے باہر سے لکڑی کا بڑا اور چوڑا سا دروازہ بند کر گیا تھا۔ دیپک لال بغل میں اپنا سرخ قیمتی کمبل دبائے ہوئے تھا۔ حتی الامکان بنا آواز کے وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا۔ خدا بخش پہلے سے زیادہ سہم گیا۔ چاند کی روشنی کے سامنے دیپک کا ہیولا اسے دہلا رہا تھا۔ دیپک لال اندر داخل ہوا اور اسی احتیاط سے



پھاٹک بند کیا اور رکتے رکتے چلتا اس کے پاس آن ٹھہرا تھا۔

''تھارے کو مائی کی یاد آرہی ہے؟'' دیپک لال نے ہمدردی سے استفسار کیا تو خدا بخش رونا بھول کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ دوبارہ بولا۔

''میں تھارے واسطے یہ گرم کمبل لایا تھا ٹھنڈ ہے۔'' دیپک لال نے آگے بڑھ کے اس سے کمبل اوڑھا دیا اور خود بھی پنجوں کے بل اس کے نزدیک ہوکر بیٹھ گیا۔ اب دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی شکل تک رہے تھے۔ پورے چاند کی روشنی دونوں کے چہروں پہ پڑ کر انہیں جگمگا رہی تھی۔ بچپنے کی اجلاہٹ تھی جو چمک بن کے چہروں پہ چھائی تھی۔

''تھارو نام کاں ہے؟'' (تمہارا نام کیا ہے) دیپک لال نے اشتیاق سے پوچھا۔ جواب میں خدا بخش کی پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

''خدا بخس۔ ہمارا نام خدا بخس ہے۔''

''تھے مسلمان ہو؟'' دیپک لال نے ذرا آگے کو جھک کر پوچھا۔ خدا بخش نے سہمے انداز میں اثبات میں گردن ہلا دی۔ دیپک لال کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر وہیں اس کی دری پہ پیر پسار کر بیٹھ گیا۔

''یہاں بہت اندھیرو ہے۔ میں تھارے ساتھ ہی بیٹھ جاتا ہوں۔ اجارو ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔'' خدا بخش کا جواب سنے بنا وہ تسلی سے کمر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ خدا بخش بھی اطمینان سے چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور اپنے اوپر اوڑھا سرخ کمبل ایک طرف سے دیپک لال کو اوڑھا دیا۔ نیم اندھیرے میں دیپک لال کی بھولی بھالی ہنسی گونجی اور خدا بخش کو بھی ہنسا آگئی تھی۔ دونوں کچھ ہی دیر میں اس طرح باتیں کررہے تھے جیسے بہت پرانے دوست رہے ہوں۔ دیپک لال کسی ساتھ کا ترسا ہوا بچہ تھا۔ وہ خود سے نئی نئی منی سی داستانیں گڑھ کے خدا بخش کو سنا رہا تھا تاکہ وہ اس کا پکا دوست بن جائے۔ دونوں کو خبر بھی نا ہوئی اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ کب سوئے کہ پو پھٹتے جب ملازم باڑے میں داخل ہوا تو دیپک لال کا سر خدا بخش کے کندھے پر تھا اور خدا بخش کا سر دیپک لال کے سر پر اور دونوں زمانے بھر سے بے خبر نیند پوری کررہے تھے۔ اگلے چند منٹ میں پوری حویلی میں بھونچال آگیا تھا۔

☆......☆......☆

دیپک لال اپنے کمرے میں محصور تھا اور اس کی مائی اس کے ساتھ جہازی سائز نواڑی پلنگ پہ بیٹھی اس کا ہاتھ تھامے سہلا رہی تھی۔ ہر دو پل بعد دیپک لال کو جھٹکا سا لگتا اور وہ سہم کے کمرے کی کھلی کھڑکی کو تکنے لگتا جہاں سے خدا بخش کے چیخنے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے ہی اسے بید کی چھڑی چھوتی وہ چلاتا اور اس کے چلانے سے دیپک لال کانپ جاتا تھا۔ یہ اس سے کیا ہوگیا تھا۔ اس کے کارن خدا بخش کو مار پڑ رہی تھی۔ وہ ایک نجس مسلمان کے ساتھ رات گزار کے آیا تھا۔ اس کی مائی نے اسے پاک کیا تھا اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کے کمرے میں لے آئی تھی کیونکہ اس کا باپ انتہائی طیش میں تھا۔ وہ بیٹے کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن سارا غصہ خدا بخش پر اتر رہا تھا۔ کرپا شنکر کو لگ رہا تھا جیسے خدا بخش نے جان بوجھ کے دیپک لال کو رات اپنے پاس ٹھہرایا تھا تاکہ وہ بیمار پڑ جائے۔ جب کہ وہ تو دیپک کو سرے سے جانتا تک نہیں تھا لیکن ساز نکالنے کا بہانہ تھا جو کسی مسلمان نے نکلتا تو بات بھی تھی۔ خدا بخش کی چیخیں دم توڑ رہی تھیں لیکن بید کی ظالم چھڑی کو قرار نہیں تھا۔ تبھی دیپک لال کا سانس اکھڑنا شروع ہوا تھا۔ وہ پہلے لمبے سانس بھرتا رہا اور پھر جب دقت بڑھی تو منہ کھول کے زخرے تک سے آواز نکال نکال کے سانس لینے لگا۔ اس کی ماں بوکھلا کے اس کی پیٹھ اور ہاتھ سہلا رہی تھی۔ جب وہ نا سنبھلا تو راجستھانی ساڑی کا پلو منہ پہ دھرے وہ روتی ہوئی باہر کو بھاگی۔ حویلی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کرپا شنکر نے ملازموں کو بھگایا وید جی کو لینے اور خود لنگی سنبھالتا بید کی چھڑی خدا بخش کے ادھ موئے وجود پر اچھال کے بیٹے کے کمرے کی اور بھاگا۔ دیپک لال بستر پہ لیٹا کم بیٹھا سا سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔ دمے کی ہلکی شکایت تو

اسے رہتی تھی لیکن آج یہ شدت معمول سے زیادہ تھی۔ کرپا شنکر نے دو گالیاں زیرلب خدا بخش کو دیں اور دیپک لال کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ من ہی من گیتا کا پاٹ کرنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ ساری نحوست خدا بخش کی ڈالی ہوئی ہے جس کی وجود کے باعث اس کا اکلوتا لعل بیمار پڑ گیا تھا۔ وید جی کے آنے تک دیپک لال بے سدھ ہو چکا تھا۔ وید جی نے آ کر تھیلے سے کوئی دوا نکال کر سنگھائی۔ کوئی عرق حلق میں ٹپکایا لیکن دیپک کے دم میں دم نا آیا۔ پریشان ہو کر وید جی نے سر جھکاتے ہوئے نیم شرمندہ سے انداز میں کرپا شنکر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سرکار یو ہمار بس کی بات نا ہی ہے۔ تمے برکت اللہ حکیم کو بلوا لیو۔ چھورے کا علاج وہی کر سکت ہے۔ ہم کا معاف کر دیو۔'' یہ کہہ کر وید اپنی لنگی اور بکسہ سنبھالتا وہاں سے نکل گیا اور کرپا شنکر جیسے سکتے میں بیٹھا صورت حال پہ غور کر رہا تھا۔ وہ ایک مسلمان حکیم کا احسان لے گا یہ تو اس کی غیرت کو گوارا ہی نہیں تھا لیکن دیپک کا سانس ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور اس کی ماں بے آواز روتی، کرلاتی اسے التجائیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لاچار ہو کر اس نے برکت اللہ حکیم کو بلوا بھیجا اور ایک ہی نسخے سے دیپک لال کچھ ہی دیر میں بھلا چنگا ہو گیا تھا۔

''بچے کو بلاوجہ روک ٹوک مت کرنا اور بارلے (باہر) کھلی ہوائیں بھیجو۔ کمرے میں بند رکھنے سے سانس گھٹے گا۔ کھیل کود کا من ہووے تو اسے کھیلنے دو۔ مرض اتنا شدید نہیں ہے لیکن اگر تکلیف میں آئے گا تو سانس جلدی اکھڑے گا۔'' کرپا شنکر نے کڑوی گولی کی طرح برکت اللہ حکیم کی بات حلق سے نیچے اتاری اور انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ راستے میں دالان پار کرتے حکیم برکت اللہ نے خدا بخش کو بے سدھ پڑے دیکھا تو فوراً پاس بیٹھ کے نبض ٹٹولی۔ وہ محض بے ہوش تھا۔ برکت اللہ حکیم نے خشمگیں نگاہوں سے کرپا شنکر کو گھورا تو وہ گڑبڑا گیا۔

''ایس کا باپو رکھوا کے گیا ہے۔ قرجالیا ہے اوس نے۔ بدلے میں چھوڑ کے گیا تھا۔ ذرا تنگ کر رہا تھا تو کس بل نکال لیے ہم نے۔'' برکت اللہ حکیم نے غصے سے اسے گھورا اور خدا بخش کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے بولے۔

''اسے گرمائش پہنچاؤ اور کھانے کو دو۔ یہی ہمارا اجرت ہووے۔'' برکت اللہ حکیم بنا پیسے لیے وہاں سے چلے گئے اور کرپا شنکر نے ملازم کو خدا بخش کو وہاں سے ہٹانے کا کہہ کر واپس اندر دیپک کے کمرے کی راہ لی تھی۔

☆......☆......☆

''واہ دادا، مزہ آ گیا۔ مجھے تو لگا میں اپنے دیس کا کھا رہا ہوں۔ وہی ذائقہ، وہی لذت۔ یہ حلوہ پوری تو لاجواب تھی دادا لیکن آپ نے کچھ کھایا کیوں نہیں؟'' ریان شکم سیر ہو چکا تھا اور وہ دوبارہ چل پڑے تھے۔ اس کے حلق سے ایک نوالہ بھی اتر نہیں سکا تھا۔ ریان کی بات پر چلتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر بغور دیکھا۔ وہاں جھریوں اور نسوں کا جال تھا۔ وہ بدقت اپنے آنسوؤں پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''میں نے ابھی ان ہاتھوں سے قبر کھودنی ہے ریان۔ رزق کیسے کھاتا۔ میرے پیٹ پہ تو عرصہ ہوا راکھ جم چکی ہے۔ ہڈیوں کی راکھ۔ مجھے خوراک ہضم ہی کب ہوتی ہے۔''

''اسی لیے آپ ہمیشہ سے بہت کم کھاتے ہیں ناں دادا۔ کبھی بتاتے تو ہیں نہیں۔ جب پوچھو ٹال جاتے ہیں، اب بھی مجھے کچھ نہیں پتا کہاں جانا ہے۔ بس آپ کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔''

''بس پھر آتے رہو۔ ہمیں شمشان گھاٹ کے ساتھ پرانے مندر کے پیچھے کنویں تک جانا ہے۔''

''یار دادا کیوں ڈرا رہے ہیں۔ مجھے تو سن کے ٹھنڈے پسینے آنے لگے ہیں۔ نا کریں یار۔''

''خاموش رہو ریان اور چلتے رہو میرے پیچھے۔'' وہ نیم خفگی سے اسے پلٹ کے دیکھتے ہوئے بولا اور پھر حتی الوسع تیز چلنے لگا۔ بڑھاپا تھا اب تو ہمت طاقت بھی نا رہی تھی لیکن وہ یہاں کسی سے ملنے آیا تھا اور جس سے ملنے آیا



تھا اس کے لیے وہ اپنی سانسیں دے سکتا تھا یہاں تو بس اکھڑ ہی رہی تھیں۔

ناک کی سیدھ میں چلتے اب وہ اور ریان ارد گرد مکانات کی بھرمار پہ نگاہ ڈالتے چلے رہے تھے۔ ریان شوق اور جوش سے دیکھ رہا تھا جبکہ اس کی نگاہوں میں انجھی سی مایوسی تھی جیسے وہ چاہتا تھا کہ اب بھی یہاں ریت کا میدان ہوتا اور دور تک محض کہیں کہیں لگے درخت اور جھاڑیاں۔ جن کے بیچوں بیچ بھاگتے دوڑتے وہ اور دیپک لال صبح سے شام کیا کرتے تھے۔ ریت کے ٹیلے پر اب بھی ان کے قدموں کے نشانات تھے جو بس وہ دیکھ رہا تھا۔

کرپا شنکر نے اگلی صبح ہی خدا بخش کو کوٹھری میں بند کروا دیا تھا اور ملازموں کو چکی وہاں پہنچانے کا کہہ دیا تھا۔ اب اسے وہیں بیٹھ کے سارا دن چکی چلانی تھی اور گندم پیسنی تھی۔ وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ دیپک لال نے طبیعت سنبھلتے ہی فوراً صحن کا رخ کیا اور اسے ہر جگہ تلاشا تھا۔ جب کہیں نا ملا تو منیم جی سے پوچھا۔ جواباً اس نے ڈرتے ڈرتے بتا تو دیا کہ خدا بخش کہاں ہے لیکن دیپک لال کو اپنا نام لینے سے منع کر دیا تھا۔ دیپک لال طیش دباتا کوٹھری کی اور چل دیا۔ وہاں اتنا سا خدا بخش گندم کے ڈھیر کے پیچھے چھپا چکی چلانے میں ہلکان ہو رہا تھا جس کی ہتھی نے دو منٹ میں اس کے ہاتھوں کی جلد کو چھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ روک کے انہیں منہ سے سانس پھونک کے ٹھنڈا کرتا اور پھر دوبارہ شروع ہو جاتا۔ دیپک جلدی سے آگے بڑھا اور اسے یہ سب چھوڑ کے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

''تمے ادر سے جاو دیپک۔ تھارے باپو نے دیکھ لیا تو منے بوہت مارے گا۔ کل ماری چمڑی ادھیڑ دی اوس نے۔ تمے جا بس اور سے۔'' خدا بخش کل کی مار سے بے سدھ رہا ہوا تھا۔ اب بھی اس کی کمر سرخ لکیروں کی وجہ سے تکلیف میں تھی۔ وہ دوبارہ بید کی چھڑیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دیپک لال نے افسردگی سے اسے دیکھا لیکن خدا بخش نے بنا پرواہ کیے چکی کی جانب توجہ مبذول رکھی۔ دیپک کا

تنفس تیز ہونے لگا۔ وہ گھسٹتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ شاید اسے اپنی بات منوانے کا گر آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ملازم بوری لاد کر وہاں آیا تو دیپک کو اس حال میں اور خدا بخش کو متوحش سا اسے بے بسی سے تکتا دیکھ، وہ انہی قدموں واپس بھاگا۔ حویلی دوبارہ گونج اٹھی۔ چیخ للکار اور وید جی کی پکار۔ دیپک کی میا سارہی سنبھالتی گرتی پڑتی پہلے وہاں پہنچی تھی۔ کچھ ہی دیر میں کرپا شنکر دکان کھلی چھوڑ کر حویلی میں موجود تھا۔ دیپک لال کو تب تک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور حکیم برکت اللہ اور وید جی دونوں کو پیغام بھیجا جا چکا تھا۔ برکت اللہ حکیم پہلے پہنچے اور دیپک لال کی حالت دیکھتے ہی تادیبی انداز میں باپ کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''کہا تھا ناں کہ بچے کو ٹوکنا مت۔ اس کی بات پوری کر دینا۔ ابھی طبیعت سنبھلی بھی نہیں اور تم لوگو نے اس کی دوبارہ ویسی ہی حالت کر ڈالی۔ مرض کی شدت بڑھ جائے گی ایسے سنار بابو۔'' کرپا شنکر بے بسی سے سر پہ ہاتھ مارتا بولا تھا۔

''ہمار ایک ہی لڑکو ہے حکیم جی۔ ہمار عقل گھاس چرنے گئیو ہے کا کہ ہم اس کی بات نا لیں گے۔ دِنش ہے ہمارا ہم جی دِنش۔ گھنو پیار ہے اس سے۔ تمے اس کو ٹھیک کر دیو ہم وچن دیتے ہیں دوبارہ اس کی یو حالت نا ہی ہونے دیں گے۔'' حکیم جی نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر بچے کو دیکھنے لگے۔ کرپا شنکر اس دوران باہر جا کر ملازموں سے پوچھ پڑتال کرنے لگا۔ بات گھوم پھر کے خدا بخش پہ آن ٹھہری تھی۔ کرپا شنکر کا مارے غصے کے دماغ پھٹنے کو آ گیا۔

''آج یو چھورا مارے ہاتھ سیر ہی جاوے گا۔'' وہ کوٹھری کی جانب لنگی سنبھالتا بڑھا تھا کہ ملازم نے بتایا کہ حکیم صاحب اسے بلا رہے ہیں۔ ارادہ ملتوی کرتا وہ واپس دیپک کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا دیپک لال بھلا چنگا سا پلنگ سے کمر ٹیکے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں بھی قریب دوسری جانب اس کے پہلو سے جڑی ایک ہاتھ اس کے

شانے پر پھیلائے اور دوسرے سے گھونگٹ نکالے بیٹھی تھی۔

"چلتا ہوں اب۔ خیال رکھیو۔ بچے کو وہ دو جس سے وہ خوش ہووے ہے۔ روز روز کا دورہ اچھا نہیں۔" برکت اللہ حکیم معنی خیز نگاہوں سے دیپک کو دیکھ کر اپنی صندوقچی اٹھا کے چلے گئے۔ کرپا شنکر دیپک کے سرہانے آن بیٹھا اور اسے خود سے لگاتے بڑی محبت سے پوچھا۔

"دیکھ دیپو۔ تھارے کو جو چاہیے مارے سے بول لیکن یوں مارے کو ستایو مت۔ تھارے منوا جو بے مانگ لے۔ میں تھارے واسطے ساری دنیا کی دولت قدموں میں لاد سکت ہوں۔"

"باپو......" دیپک لال باپ کی نرمی دیکھ کے متاثر ہوتے ہوئے بولا تھا۔ "او......او خدا بخس کو مارے ساتھ رہن دیو۔ مارے کو او بوت اچھا لاگت ہے۔ تھے اسے کچھ نا کہو۔ اسے مارو مت۔ او باپو۔ او منے پسند ہے۔ مارا دوست ہے او۔ کرپا کردناں باپو، بنتی کرتا ہوں۔" اور کرپا شنکر سنار کا سارا لہو سمٹ کے چہرے پہ آن سمایا۔ ایک مسلمان کا چھورا اس کے لڑکے کے اس قدر قریب کب ہوا کہ بیٹا اس کی خاطر جان ہلکان کیے ہوئے ہے۔ کرپا شنکر نے بے حد وقت سے اپنے اعصاب کو قابو کیا اور اسے بہلاتے ہوئے بولا۔

"جو میرا لاڈلو کہے گا اوہی ہووے گا۔ تھے فکر نا کر۔ بس بھلا چنگا ہو جا جلدی سے۔" اس کا ماتھا چوم کر اسے لٹاتے ہوئے اس نے گھورتی نگاہ بیوی پہ ڈالی اور اشارے سے اسے باہر چلنے کا کہا۔ وہ پریشان سی گھونگٹ سنبھالتی ساتھ ہولی۔ برآمدہ پار کرتے ہی اس نے بیوی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"تھارے ہوس کدھر گم ہیں پشپا۔ تھارو چھورا ایک موسلے کے ساتھ دوستیاں بنائے ہے اور تھے بے خبر ہووے۔ اوس چھورے کا تو آج قصہ ہی تمام کرتا ہوں لیکن تھے اپنے چھورے کو سمجھا دے کہ منے اس کا کسی مسلمان سے کھیلنا نہی بھاوے ہے تبھی۔" وہ اس پر غراتا واپس مڑنے کو تھا جب پشپا نے اس کی بانہہ پکڑ کر التجائیہ لہجے میں اس سے کہا۔

"دیپو کے باپو۔ تھے مارو واسطے بھگوان ہووے۔ منے کبھی تھاری بات ناہی ٹالی پر ہمارا ایک ہی لڑکو ہے۔ تھے اس کا دل رکھن کی خاطر اوس مسلمان چھورے کو کچھ منتی کہو۔ ماخود دیپو کو سمجھا لوں گی بس اوس کی طبیعت تھوڑی سنبھلنے دیو دیپو کے باپو۔ ماں ہاتھ جوڑو ہوں تھارے آگے۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور کرپا شنکر سوچ کے عالم میں حویلی کے صحن میں دکھائی دیتے پھل دار درختوں کو گھور رہا تھا۔ ایسی صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کیسے اپنے بیٹے کو ایک مسلمان کی اولاد سے قریب ہونے دیتا لیکن بیٹے کی طبیعت اور پژمردہ حالت اسے نرمی برتنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ وہ بے بسی سے سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا تو پشپا سکون کا سانس لیتی ساڑھی سنبھالتی بیٹے کے کمرے کی جانب پلٹی۔ باپ کے آنے سے پہلے دیپک لال نے ماں کے آگے عرضی ڈال دی تھی اور پشپا بیٹے کی اکھڑتی سانسوں کو دیکھتے اس سے وعدہ کر چکی تھی کہ وہ خدا بخش کو کچھ نہیں ہونے دے گی۔

☆......☆......☆

یوں خدا بخش کی اور دیپک لال کی دوستی پروان چڑھی اور دنوں میں وہ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے کہ رات کے چند گھنٹے جو دیپک لال کو اپنے کمرے میں گزارنے ہوتے تھے وہ بھی عذاب لگنے لگے تھے۔ خدا بخش اب بھی حویلی کا نوکر تھا لیکن اب اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ہوتا تھا کیونکہ دیپک لال کا یار تھا وہ۔ اس کا اکلوتا بیلی۔ ملازموں کی تو جرات نہیں تھی کہ خدا بخش کو کچھ کہتے پر اب کرپا شنکر بھی بل کھانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دیپک لال کی صحت دنوں میں ٹھیک ہوئی تھی۔ گالوں پہ سرخی جھلکنے لگی تھی۔ ہاتھوں کی چرچرخ جلد بھری بھری ہو کے اپنی تلنے لگی تھی۔ حکیم جی کے مطابق یہ سب اس کے دل کی خوشی کے کارن تھا۔ وہ اندر سے خوش تھا لہٰذا اس کی بیماری بھی دبتی جا رہی تھی۔ تھوڑا بڑا ہوتا تو امید تھی کہ اثرات معدوم ہو جاتے اور دیپک لال کی ماں بیٹے کو پھلتا دیکھ کے پہلی بار کرپا شنکر کے آڑے آنے لگی تھی۔ اسے کبھی رونکھی ہو کے تو کبھی ہلکی سی دھونس کے ساتھ خدا بخش کے ساتھ کھیلنے اور پڑھنے پہ راضی کیے رکھتی۔ دن گزرے تو دونوں حویلی سے باہر جانے لگے۔ ایک ساتھ کھیلتے، شرارتیں کرتے، بیرا کھنے کرتے اور کنچے کھیلتے دونوں یک جان دو قلب ٹھہرے۔ خدا بخش کو اپنے گھر کی یاد بھی کم ہی ستاتی تھی۔ اسے دیپک لال کی شکل میں ایک ایسا دوست مل گیا تھا جو اس کی مرضی اور خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ دیپک لال اس کے لیے دیپو تھا اور وہ دیپک کے لیے بخشو۔ دیپک اسے ناراض کبھی نہیں کرتا تھا۔ ایسا ہی دیوانہ تھا وہ اس کا کہ جہاں جہاں خدا بخش جا کر کھیلنا چاہتا وہاں وہاں دیپک لال کے قدم اس کے ہم قدم ہو جاتے۔ دونوں کی ایک من پسند جگہ تھی جہاں وہ کھیلتے تو کوئی انہیں دیکھنے والا نا ہوتا۔ شمشان گھاٹ کے ساتھ پرانے مندر کے پچھواڑے کھوئی۔

جس کا پانی کبھی کا خشک ہو چکا تھا۔ یہ کھوئی ویران تھی۔ اردگرد بے تحاشا خودرو جھاڑیاں اور جنگلی جڑی بوٹیوں کی افزائش ہو چکی تھی۔ دور سے دیکھنے میں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی کنواں ہے۔ کائی زدہ اینٹیں جھاڑیوں کا حصہ لگا کرتیں۔ یہاں بہت کم کسی کا آنا جانا تھا لیکن کئی دنوں سے دیپک لال اور خدا بخش نے جیسے اسے آباد کر دیا تھا۔ وہ دونوں کنچے لیے وہاں آ جاتے اور جی بھر کر کھیلتے۔ غلیل سے پرندوں کے نشانے لیتے۔ دیپک لال کو خدا بخش نے غلیل چلانا سکھائی تھی اور کچھ ہی دن میں طاق کر دیا تھا۔ چھپن چھپائی کھیلتے لیکن دیپک لال کھوئی کے بہت قریب نہیں جاتا تھا۔ اسے خوف آتا تھا اس میں جھانکنے سے، بغور دیکھنے سے اور وہم ستاتا کہ کبھی وہ اندر گر گیا تو...... اندر تو گھور اندھیرا تھا بس۔ اسے اپنی تقدیر کا علم نہیں تھا ورنہ ایسا بھاگتا کہ دم اکھڑنے تک کبھی پلٹ کے ناں دیکھتا۔

☆......☆......☆

وہ شمشان گھاٹ سے ہوتے ہوئے اب پرانے مندر کے پچھواڑے بنی کھوئی تک پہنچ چکے تھے اور اب وہ اس کائی زدہ کو دور سے تک رہا تھا۔ یک دم آنکھوں میں وحشت سی جاگی اور وہ حلقوں سے باہر نکلنے کو بے تاب سی دکھیں۔ ریان نے آگے بڑھ کے چھوٹے دادا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو جیسے وہ نیند سے جاگا۔

"فلاسک میں پانی ہے ریان؟" اس کی پھنسی سی اجنبی آواز پر ریان نے فوراً فلاسک نکالا اور اس کی اور بڑھا دیا۔ وہ منہ سے لگا کے چند گھونٹ بمشکل حلق سے اتار پایا اور پھر اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ یہ کھوئی اور اس سے وابستہ یادیں خاردار جھاڑی کی مانند اس کے جسم سے لپٹی ہوئی تھیں۔ جب جب وہ اس جھاڑی کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کرتا تب تب اس کے جسم کا گوشت ریشہ ریشہ ہو کر ہڈیاں چھوڑنے لگتا۔ قدم قدم وہ اس کھوئی کے قریب ہو رہا تھا اور قدم قدم اس کے پیروں سے جان نکل رہی تھی۔ ایک پل کو دل کیا وہ یہیں سے واپس ہو جائے، پلٹ جائے، جیسے ساری زندگی روتے سسکتے گزار آیا تھا ویسے ہی گزار کے مر جائے اور مٹی میں دب جائے۔ اس کے آزار اس کے ساتھ مٹی ہو ہی جائیں گے لیکن وہ کیا کرتا کہ آج بھی اس کا دیپو اسے بلاتا تھا۔ وہ اسے آوازیں دیتا تھا۔ وہ کان لپیٹ لیتا تب بھی اس کی آواز اس کے سینے کے گنبد میں بازگشت کی مانند گونجتی رہتی اور اس کی پسلیاں تک تھرتھراتی رہتیں۔ اس نے اپنی ہانپتی سانسیں جمع کر کے سینے میں بھریں اور بوجھل پلکیں اٹھا کے سامنے دیکھا تو دیپو کھڑا تھا۔ دونوں بانہیں وا کیے وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔ وقت حال پھلانگ کے واپس ماضی میں سرکھسیٹ رہا تھا۔ وہ دونوں گھٹنوں کو کچی زمین پہ ٹیک کے آنکھیں بند کیے اس کے سنگ ہو لیا۔

☆......☆......☆

وہ دونوں بلاناغہ کھوئی کے پاس کھیلنے آتے تھے۔ اب تو ایک انسیت سی ہو گئی تھی اس جگہ سے۔ مندر کی گھنٹیاں بجتیں اور دیپک لال دونوں ہاتھ جوڑ کے ماتھے سے لگاتا

اور عقیدت سے آنکھیں بند کر کے چند پل کچھ بڑبڑاتا اور پھر سے کھیل کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔ خدا بخش اسے بغور دیکھتا لیکن کہتا کچھ نہیں تھا۔ دونوں پر ایک دوسرے کے دین دھرم کا فرق واضح تھا۔ دیپک لال ایک دن اپنے ساتھ گھر کے مندر کا پرساد اٹھا لایا اور بڑے شوق سے خدا بخش کو کھانے کو دیا۔ خدا بخش نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"منے جائز نا ہووے۔ بتوں کو چڑھا ہوا نہیں کھاتے ہم۔ گناہ لگتا ہے بوہت۔" دیپک لال نے خدا بخش کو ٹوک دیا تھا۔

"بخشو...... ما تھارے ساتھ مسجد گو تھا تو تب امام جی نے مارے کو نیاج والے چاول پردسے تھے تو منے خوس ہو کے کھا لیے تھے پر تھارے منیں ما مارے دھرم کے واسطے پریت کیوں نا ہی ہووے۔ تنے کبھی مارے بھگوان کے چرنوں کا پھل نہیں کھایا۔ مارے کو آج بتا کہ تھارے من میں کیسی الجھن ہے۔" خدا بخش ہنس دیا اور ہاتھ میں تھامے کنچوں میں سے ایک کو اچھال کے واپس پکڑتا ہوا بولا۔

"الجھن کا ہے کی دیپو۔ دیکھ سیدھی سی بات یو ہے کہ ہمار دین میں یو سب حرام ہووے۔ ہم کسی بت کو سجدہ نہیں کرتے نا اس کے چرنوں پہ دھری چیج کھاتے ہیں۔ چل مارے کو ایک بات بتا۔ تنے امام جی کی دی ہوئی چیج کھائی تو کیوں کھائی؟"

"کیونکہ مارے کو اچھی لگی۔ من ما شانتی اتری تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بوہت پوتر (پاک) ہے اور جب جب منے کچھ کھایا ہے نا تب تب منے رات میں سوتے ڈر نہیں لگا۔ یو پتا نہیں کیا بات ہووے لیکن بخشو ایسا مارے کو محسوس ہووے ہے۔" دیپک لال نو سال کا بچہ تھا اور اس کی سمجھ ابھی شرک و بت پرستی کو نہیں پرکھتی تھی جو اس نے محسوس کیا یا جو اسے مناسب لگا وہی اس نے کہہ ڈالا۔ خدا بخش ہنسا اور اس کے گال پہ چٹکی بھرتے ہوئے بولا۔

"یو تو تھارے کو کچھ سمجھ نہیں آیا تو کہہ دیا تنے۔ لاکن مارے مجہب (مذہب) ما صرف اللہ کی عبادت جائج ہووے۔ باقی سب سرک (شرک) ہووے۔"

"سرک کیا ہووے؟" دیپک لال نے سہم کے پوچھا تھا۔

"دیپو جو بھی گیر (غیر) اللہ کی عبادت کرت نا وہ سرک کرت ہے۔ جیسے تھارے بھگوان کو سجدہ کرنا یا او کے چرن ما پھل رو پیار رکھنا یو سب سرک ہووے۔ بس منے اتنا ہی پتا ہے۔ امام جی نے بتایا تھا یو سب۔"

"تو بخشو کیا گیر اللہ کی عبادت کرن والا نرک میں جاوے گا؟" دیپک لال کی سرسراتی آواز نکلی اور خدا بخش کو گنگ کر گئی۔ وہ کیا جواب دے۔ جواب اسے معلوم تھا لیکن دیپک کا پیلا چہرہ دیکھ کے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ جان بوجھ کے اس کا دل نہیں دکھاتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دیپک بہت حساس ہے۔ چند پل مزید اسی خاموشی بھری کشمکش میں گزر گئے تو یک دم خدا بخش بولا۔

"اچھا چل...... تھارے کو رات میں ڈر لگتا ہے ناں اندھیرے سے۔ ما تھارے ایک دعا یاد کرا دیتا ہوں۔ تجھے جب بھی ڈر لگے ناتو اس کو پڑھ کے اپنی چھاتی پہ پھونک لیو پھر دیکھیو کیسے بھوت بھاگتا ہے۔"

"تجھے منے یاد کرانا بخشو۔ دیکھ مائی اب کہتی دیپو تجے بڑو ہو گئو۔ یہ بھوت پریت تھارے کو کج بھی نا ہی کہت اب۔ او ماری بات ہی نہی مانتی۔"

"لے فر۔ فکر متی کر۔ ابھی یاد کرائی دیتا ہوں تھارے کو۔" خدا بخش نے چوری چوری دیپک لال کو آیت الکرسی یاد کروا دی۔ امام جی کے پاس مسجد لے گیا اور سینے پہ دم کروا دیا۔ امام جی نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھا تھا۔ دیپک لال کی نگاہوں میں عقیدت کا دریا موجزن تھا۔ وہ خاموش سے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اکیلے میں خدا بخش کو سمجھایا کہ تم کسی کو کانوں کان خبر مت ہونے دینا کہ دیپک کو میرے پاس لائے ہو۔ خدا بخش کچھ سمجھا کچھ نا سمجھ کر کے سر ہلاتا چلا گیا لیکن امام جی کو فکر مند کر گیا تھا۔ جاتے ہوئے خدا بخش قاعدہ اٹھا لے گیا مسجد سے اور دو کھجور کی نئی



ٹوپیاں۔ امام مسجد نے سر تھام لیا تھا لیکن منع بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن سے دیپک لال کو ایسا چسکہ لگا کہ رات گہری ہوتے ہی وہ اپنے کمرے سے نکلتا اور باڑے کے ساتھ بنی چھوٹی سی کوٹھری کا کواڑ اس انداز میں بجاتا کہ خدا بخش کے ساتھ سویا ملازم نا اٹھنے پائے۔ کرپا شنکر نے محض دیپک لال کا دل رکھنے کی خاطر خدا بخش کا سونا جاگنا اس باڑے سے کوٹھری میں منتقل کر دیا تھا۔ دیپک لال کو یہی کافی تھا۔ وہاں وہ سہولت سے خدا بخش کو ساتھ لیتا اور حویلی سے کھیلنے کو نکل جاتا اور جب حویلی میں ہوتا تو خود وہیں پایا جاتا۔ اس کی ماں سب جانتی تھی لیکن شوہر کو خبر نہیں ہونے دی کہ کہیں وہ دوبارہ دیپک پر پابندی نا لگا دے۔ جس دن سے دیپک کو خدا بخش کا ساتھ ملا تھا اس دن سے اسے ایک بار بھی دمے کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس کے شکر کو یہی کافی تھا۔ دیپک اور خدا بخش کی جوڑی دیکھ کے وہ ایک تکلیف وہ ہوکا تو بھرتی تھی لیکن اکلوتے بیٹے کی خاطر اسے دبا لیتی تھی۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ دونوں کا یہ ساتھ کیا رنگ لائے گا تو وہ یہیں سب کچھ ہونے سے روک لیتی۔ وہ شاید اس دیپک کو بجھا دیتی جس سے اس کے آنگن میں اجالا تھا لیکن وہ بے خبر تھی کہ جو دیا دیپک لال کے دل میں جل اٹھا تھا اس کی روشنی سے اس کے دل کا میل دھل رہا تھا۔ سیاہی سفیدی میں بدل رہی تھی اور باطل کو حق چت کر رہا تھا۔ خدا بخش کا باپ دوبارہ اسے لینے آ چکا تھا لیکن نا خدا بخش یہاں سے جانے کو تیار ہوتا تھا نا دیپک اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ کرپا شنکر کا قرضہ اتر چکا تھا اور وہ مزید ایک دن بھی خدا بخش کو سہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اسے اس کے باپ کے حوالے کیا اور سکون کا سانس لیا جیسے اس کی حویلی سے کسی غلاظت کا خاتمہ ہوا ہو۔ دیپک لال تڑپ تڑپ گیا لیکن خدا بخش نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب وہ اپنی گٹھڑی اٹھائے نکل رہا تھا تو باڑے کے پچھواڑے دیپک اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ خدا بخش اسے دیکھ کر باپ کا ہاتھ چھڑاتا ہوا اس کے قریب بھاگ کر پہنچا۔

"تجے رونا ہے دیپو؟ دیکھ ما بھی پریسان ہو گیو سے جب بابا منے لینے آیا لکن فر سوچا کہ ما را جانا ہی بہتر ہوگا۔ اب دیکھ ناں تجے جب جا ہے منے ملن واسطے امام جی کی مسجد بھی آسکت ہے۔ حویلی سے نکل کر تو ہم کا کتنے رستے بدلنے پڑت تھے۔ یو کے بابو کے ملازم پیچھو آتے تھے اور ہم دوناں کو کتنی مسکل ہوتی تھی کھوئی تک جان میں پھر وہاں سے امام جی کے پاس۔ اب جب تجے نکلے گا ناں حویلی سے تو کوئی تھارو پیچھو نہیں آئے گا کیونکہ تھارے بابو کو مارے پہ سک ہووے کہ منے تھارے کو بگاڑ دیے۔ جب تجے اکیلا نکلے گا ناں تو او کا چنتا نا ہی ہوگی۔ سمجھ رہو نا ماری بات؟" خدا بخش بڑی مصلحت اندیشی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دیپک کے چہرے پہ پریشانی اور دکھ کے سائے اسے مزید سنولا رہے تھے۔ وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

"تجے منے بھل تو نا ہی جائے گا نا بخشو۔ دیکھ منے آیت الکرسی یاد کر لئی اب تجے مارے کو وچن دیا تھا کہ منے نماج سکھائے گا۔ بھل تو نہیں جائے گا ناں اپنا وچن؟"

"ششش...... ششش، چپ کر، مروائے گا منے کا کر دیپو۔ دھیرے بول۔" دونوں نے اردگرد چوکنی نگاہوں سے دیکھا وہاں بس کچھ فاصلے پر خدا بخش کا باپ کھڑا تھا بیزار صورت بنائے وہ خدا بخش کو گھور رہا تھا تا کہ وہ جلدی کرے لیکن منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ دیپک لال کے ساتھ تھا وہ۔

"ماری بات پہ کان دھر دیپو۔ تجے جب بھی حویلی سے نکلے تو سیدھا کھوئی پہ پہنچیو۔ جے کوئی تمہارا پیچھا کر رہیا ہووے تا اوس کو اے ہی لاگے کہ تجے مندر جاوت ہے۔ ما بھی وہیں تھارے کو ملوں کروں گا۔ وہیں سے دوناں مسجد کو نکل لیے کریں گے۔ کے سمجھا؟" دونوں میں ڈیل ہو گئی تھی۔ دونوں نے تمتماتے چہروں کا جوش چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہاتھ ملائے اور گلے مل کے ایک دوسرے کو الوداع کہا تھا۔ دیپک لال واپس حویلی تو مڑ گیا

تھا لیکن دل اور روح خدا بخش کے ساتھ روانہ کر آیا تھا۔ اس کا دل حویلی میں پہلے ہی نہیں لگتا تھا اور اب خدا بخش کے جانے سے وہ مزید بیزار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کرپا شنکر اور اس کی بیوی پیار محبت نچھاور کرتے تاکہ وہ خدا بخش کو بھول جائے اور اس کی یاد میں اسے دمہ کا دورہ نا پڑے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ خدا بخش سے مندر کے پچھواڑے پرانی کھوئی پہ ملتا ہے۔ چند دن کرپا شنکر نے اس کا پیچھا کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ مندر جاتا ہے اور وہاں مورتیوں کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا رہتا ہے۔ ملازم کے بتانے پر کرپا شنکر کا برہمنی خون رگوں میں مارے خوشی کے اچھلنے لگتا کہ اس کا واحد سپوت مذہب کے قریب ہو رہا ہے۔ دیپک لال چوکس رہا کرتا تھا جیسے ہی ملازم مندر کی سیڑھیاں واپسی کے لیے اترا کرتا وہ اپنی جگہ چھوڑ کر پچھواڑے چلا جاتا جہاں خدا بخش پہلے سے موجود ہوتا پھر وہ ہوتے اور ریت اڑاتی کچی پگڈنڈیاں جن کے اختتام پر مسجد کا دروازہ آتا تھا اور اس کے پیچھے دیپک کے من کا سکون چھپا تھا۔ وہ کلمہ پڑھ چکا تھا۔ امام مسجد نے اسے اسی دن کلمہ پڑھانے میں پل بھر کی تاخیر نہیں کی تھی جس دن اس نے پہلی بار فرمائش کی تھی لیکن اسے تاکید کی تھی کہ گھر والوں کو خبر نا ہونے دے تاوقتیکہ کچھ بڑا نا ہو جائے یا حالات اس کے حق میں نا ہو جائیں۔ اس نو سالہ بچے کا دل کرتا تھا وہ چیخ چیخ کے دنیا کو بتائے کہ وہ مسلمان ہے۔ اس نے خدا بخش کا دین قبول کر لیا ہے۔ وہ اس کے ایک اللہ پر ایمان لے آیا ہے لیکن وہ ابھی بچہ تھا اور اس کے پاس نا الفاظ تھے نا اظہار کا سلیقہ۔ بس وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ اس کا دل پھر گیا تھا اس کی طرف جو سچ تھا جو حق تھا اور ازل سے تھا۔ وہ گھر میں اب بھی مورتی کے آگے بیٹھتا تھا۔ اب بھی ہاتھ جوڑے آنکھیں میچے جھومتا تھا پر یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس دوران وہ امام جی کے سکھائے توبہ کے کلمات دہراتا رہتا تھا۔ اس کی ماں اسے پرساد دیتی وہ چپ چاپ ہتھیلی میں دبائے وہاں سے اٹھ جاتا اور جاتے ہوئے باڑے میں گائے کو چٹا جاتا۔ عجیب ڈرے سہمے دن تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ کے نماز پڑھنے کی کوشش کیا کرتا تھا جو ابھی اسے ٹھیک سے ازبر نہیں تھی نا ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کس نماز میں کتنی رکعتیں پڑھے۔ تشہد میں کب بیٹھنا ہے اور کب سلام پھیرنا ہے اس یہ ابھی یاد نہیں رہتا تھا لیکن شوق اور لگن تھی جو اسے کپڑا بچھانے اور اس پر تادر کھڑا رہنے پہ مجبور کرتی تھی۔ اس کا دل اکتانے لگا تھا حویلی میں مورتیوں کی موجودگی سے اور ان کے سامنے بیٹھنے سے۔ ان پہ چڑھاوا چڑھانے سے اور گھنٹیوں کی مسلسل بجتی آواز سے لیکن وہ خدا بخش کی محبت اور امام جی کے سمجھانے کی بنا پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ معمولی سی بھنک کا انجام بھی کیا ہوتا، اسے بخوبی پتا تھا۔ اسے آیت الکرسی اور سورہ اخلاص اچھے سے یاد تھی وہ اسی کو من ہی من دہراتا تھا۔ سورہ اخلاص کا ترجمہ جس دن اس نے امام جی کے منہ سے سنا تھا اس دن کی رات اس پہ نہیں اتری تھی۔ وہ سحر ہونے تک گھٹ گھٹ کے روتا رہا تھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ اس قلق کو جھولی میں لیے بلکتا رہا تھا کہ وہ اب تک بتوں کو سجدہ کرتا آیا تھا جبکہ اللہ کہتا ہے وہ واحد ہے، وہ بے نیاز ہے، کوئی بتوں کو پوجتا یا شیطان کو رب کو اس کی پرواہ نہیں لیکن وہ ہدایت دیتا ہے اسے جسے چن لیتا ہے۔ نا وہ کسی کا باپ ہے اور نا کسی کی اولاد تو وہ جن دیوی دیوتاؤں کو مانتا تھا وہ تو سب کسی نا کسی سے پیدا ہوئے اور ان کی اولادیں بھی ہوئیں یعنی دیوتاؤں کا ایک لمبا سلسلہ تھا جو شروع کہاں سے ہوا نہیں معلوم تھا اور ختم کبھی ہو ہی نہیں سکا تھا۔ رب کہتا ہے اس کے جیسا کوئی نہیں اور سب بڑائی اور بزرگی اسی کے لیے ہے لیکن جن دیوتاؤں کو اس سے سجدہ کروایا گیا وہ تو سب ایک سے ہیں، ان کی کہانیاں ایک سی ہیں، ان کی تاریخ ایک دوجے سے جڑی ہے تو سچ اور حق وہی ہوا جو یکتا ہے اور واحد ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں، نا ہمسر ہے اور یہیں آکر دیپک لال اندر سے ادھ موا ہو جاتا تھا۔ وہ جھنجھلاتا تھا خود سے اور سجدے میں سر گرا لیتا تھا کہ وہ پاپی رہ چکا ہے اور واحد اللہ اسے معاف کر دے، اس کی بخشش کر دے۔ اپنی عمر کے حساب سے وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا لیکن جانتا نہیں تھا کہ جو وہ کرتا ہے ویسا کرنا کتنے ہی لوگوں کے مقدر میں نہیں ہوا کرتا۔

دنوں نے کروٹ لی تھی اور دیپک لال اور خدا بخش کو ملنے کے لیے اب وقتوں کا سامنا ہو چاہتا تھا۔ دیش کا بٹوارا ہونے جا رہا تھا اور ملک بھر میں فسادات کی دبی دبی چنگاریاں سلگنا شروع ہو گئی تھیں۔ کوئی وقت جاتا تھا کہ کب یہ بھانبڑ بنتیں اور خلقت بھسم ہوتی۔ مسلمان اور ہندو کی لڑائی بنا ٹکٹ کا تماشا بننے والی تھی۔ ہلکی ہلکی شورش کا شکار خدا بخش اور دیپک لال کا گاؤں بھی ہو رہا تھا۔ وہ دونوں اب بھی ملتے تھے اور چپ چاپ کھوئی کی دیوار کے پیچھے نظر سے اوجھل ہوئے پیروں کے بل بیٹھے ریت پہ تنکوں سے لکیریں کھینچا کرتے۔ جیسے کرنے کو کوئی الحال بھی کام ختم ہو چکے تھے۔ تنکوں کی گڑوی ان چھوئی دھری رہ جاتی۔ جس پہ ملال کی گرد ٹھہر جاتی، باتیں بے بہا تھیں لیکن نا شروع کرنے کا بہانہ ملتا تھا نا ختم کرنے کا سرا۔ ایسے ہی ایک بے کل سے دن وہ دونوں دیوار سے کمر ٹیکے ایک دوجے سے سر جوڑے اپنی اپنی سوچوں کی دنیا کھنگال رہے تھے جب یک دم دیپو کی آواز ابھری۔

"بخشو... تے منے چھوڑ کے چلا جاسے گا؟"

"تھارے کو کس نے بولا یو؟" خدا بخش نے سیدھے ہوتے ہوئے اچنبھے سے سوال کیا۔

"رات باپو مائی سے کہہ رہت کہ مسلمان سبھی کو ادھر سے جانا پڑے گا ورنہ بوت فساد ہوگا بخشو۔" اس نے بھی دیوار چھوڑ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

"تے منے بھی ساتھ لے چل ناں اپنے۔" دیپو نے حسرت زدہ لہجے میں کہا لیکن خدا بخش جیسے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ گنگ ہو گیا تھا بولے تو کیا بولے نا بولے تو کیا نا بولے۔

"بول ناں بخشو... تے منے بھی ساتھ لے لو ناں، ما تھارے ساتھ پاکستان چلا چلوں گا۔ دیکھ ناں بخشو تیرا میرا دین دھرم بھی اب ایک ہووے۔ تے بھی مسلمان ما بھی مسلمان۔ جے تے منے چھوڑ کے چلا جاوے گا تو منے دین کی باتاں کون بتاوے گا۔ امام جی بھی چلے جاویں گے تو ما تو دیواروں سے ٹکریں ماروں گا بخشو۔ اس لیے ما بھی تھارے ساتھ پاکستان جاؤں گا۔" آخر میں اس کا لہجہ بھیگا ہو گیا تھا۔ خدا بخش کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آیا وہ انکار کرے یا اقرار۔ یہ باتیں اس کے بھی من میں کئی دنوں سے کھد بد رہی تھیں لیکن وہ کہنے میں جھجک رہا تھا۔ دیپک نے تو خیر نہیں کی تھی۔ وہ خدا بخش کے بنا تو رہ جاتا لیکن اسے جو لطف ایک ہمدم کی باتیں کرنے اور سننے میں آتا تھا اس کا کیا کرتا۔ خدا بخش اور وہ دونوں یونہی چپ چاپ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور پھر جیسے فیصلہ ہو گیا تھا۔ خدا بخش کو زبان سے کہنا نہیں پڑا اور دیپک لال نے دل کی سن لی تھی۔

"پر تھارا ناں بدلنا پڑے گا، دیپک لال بن کے تے ساتھ ناں سفر کیسے کرے گا دیپو۔ تو آج سے تھارا ناں ہووے گا کم" خدا بخش نے کنپٹی پہ انگلی بجاتے ہوئے سوچا "احمد... احمد ناں گھنو بھلا لگتا ہے منے۔ تھارا ناں احمد ہے اب سے، آج سے۔"

"گھنو پیارا ہے۔ ما آج ہی حویلی پہنچ کے اپنی پوٹلی باندھے رکھوں گا۔ تے جب بھی پاکستان کے لیے نکلے گا تو منے بھی ساتھ لیتو چلو۔ وہاں جا کر ہم دوناں کو کوئی خوف ڈر نا ہی ہوگا۔ امام جی کے پاس جانے سے بھی کوئی نا ہی روک سکے گا۔ ما کھل کے نماج پڑھ سکوں گا۔" وہ نو سال کے دو بچے اس بات سے بے خبر پلاننگ کر رہے تھے جیسے پاکستان جانا ساتھ کے محلے میں جانے جیسا تھا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں پہ کیسا عتاب نازل ہونے والا تھا اور ان میں سے کون پاکستان جا پاتا اور کون نہیں اس کا فیصلہ بھی جلد ہو جانے والا تھا۔

☆......☆......☆

دیپک لال نے ہاتھ میں تھاما آخری تسبیح کا دانہ گڑوی میں ڈالا اور تسبیح کے کھلے دانوں سے بھری گڑوی کو اپنے پلنگ کے نیچے چھپا دیا تھا۔ تسبیح کے یہ دانے ایک ہزار کے قریب تھے اور اس نے یہ دانے امام جی سے زبردستی یا بے حد مان سے لیے تھے۔ وہ خدا بخش کے ساتھ مسجد کے پچھلے احاطے میں بیٹھا ہوا تھا۔ امام جی چٹائی پر چوکڑی

مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے تسبیح کے دانے پڑے تھے جن کی وہ تسبیح پرو رہے تھے، جو تسبیح وہ پرو رہے تھے وہ مکمل ہو چلی تھی صرف اس کا امام پرونا باقی تھا۔ دیپک لال کی نگاہ باقی بچے دانوں کی طرف تھی۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ ان کی مدد سے ایک لمبی سی تسبیح بنائی جا سکتی ہے۔ امام جی نے اس کی نگاہوں کا مفہوم بھانپ کے اسے مسکرا کے دیکھا اور پوچھ لیا تھا۔

"کیا دیکھ رہا ہے احمد...... کیا چاہیے؟"

"تسبیح چاہیے مارو۔ ویسی ہی جیسو تمارے ہاتھ میں ہووے ہے۔ مارو من کرتا ہے امام جی کہ ما تاں کو جب بھی سو جاتے تبھی ما اللہ اللہ کروں۔ ایک تسبیح مارے بھی بنا دو نا امام جی۔" امام جی کو اس پہ بے طرح پیار آیا۔ کیسی قدرت تھی بے نیاز رب کی کہ جس کا باپ کٹر برہمن اور ماں بھی دیوداسی ان کے ہاں ایسی اولاد پل رہی تھی جس کا دل رب نے حق کی جانب موڑ ڈالا تھا۔ وہ بچہ اپنی عمر کے اعتبار سے بہت چھوٹا تھا لیکن اس کی عقل بہت سوں کو پچھاڑ کے راہ بنا چکی تھی۔ اس کا شعور اسے گیان دیتا تھا کہ وہ اب تک جس کو پوجتا آیا تھا وہ تو کئی بار اس کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا تب اور اس کی مائی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر شما مانگی تھی اس ٹوٹے پتھر کے ٹکڑے سے۔ اس وقت وہ بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب سے چھپ کر بار ہا ان بتوں کو کیلے میں پٹیا کرتا تھا محض اپنا تجسس دور کرنے کے لیے کہ ایسا کرنے سے وہ اسے کچھ کہیں گے یا نہیں مگر اسے بدلے میں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

امام جی نے اپنے سامنے بکھرے دانوں کو اکٹھا کیا اور خدا بخش کو پرچھتی سے چھوٹی سی گڑوی اتارنے کو کہا۔ خدا بخش فانٹ جوشیلا ہو کر اتار لایا اور امام جی کو گڑوی دے دی۔ انہوں نے سارے تسبیح کے دانے اس میں بھرے اور اس گڑوی کو دیپک لال کو تھماتے ہوئے بولے۔

"دیکھ احمد...... ما تمارے کو تسبیح بنا کے ناہی دیوں گا کیونکہ ایس طراح تمارے پکڑے جانے کا ڈر ہوگا بنوا۔ ابھی تے چھوٹا سی، تھوڑا بڑا ہو جا تو اپنا دین سب کو بتا سکت ہے لیکن ابھی ما تمارے ساتھ ساتھ خدا بخس کی زندگی بھی خطرے میں ناہی ڈال سکتا۔ اس لیے یہ دانے تے ایس طرا ہی لے جا۔ ان کو نکال کے پڑھ لیا کر اور واپس گڑوی میں ڈال دیا کرنا۔ کبھی جو پکڑو جائے تو کہہ دینا کہ گولیاں کھیلتا ہوں۔ باقی اللہ تیری حفاظت کرے گا تے فکر نا کر۔"

دیپک لال جو اب خدا بخش اور امام جی کے لیے احمد تھا، وہ تسبیح کے دانوں سے بھری گڑوی حویلی لے آیا تھا۔ اس دن سے وہ روز رات کو سب کے سونے کے بعد اٹھ کے فرش پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتا اور سارے دانے سامنے گرا لیتا پھر ایک ایک دانے پر اسم اللہ پڑھتا جاتا اور اسے واپس گڑوی میں ڈال دیتا۔ اس کام میں اسے ایسی لذت ملتی تھی جس کے بدلے کل کائنات کی دولت ہیچ تھی۔ وہ بس سرور محسوس کرتا تھا اور من کرتا کہ آنکھیں بند کیے کسی اور جہان میں چلا جائے جہاں اس کی روح ٹھہر جائے اور کبھی واپس نا آئے لیکن حویلی اور اس کا ماحول ایک اٹل حقیقت تھی جس سے وہ نگاہیں چرا نہیں سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے اپنی مائی اور باپو سے محبت نہیں تھی لیکن اس میں بھی شک نہیں تھا کہ ان کی محبت اس محبت پہ حاوی نہیں ہو پائی تھی جو اسے اللہ سے ہو گئی تھی۔ وہ اللہ کے لیے ہر شے تیاگنے کو تیار تھا اسی لیے اپنا دیش، اپنا گھر بار اور ماں باپ سب چھوڑ کے خدا بخش کے ساتھ پاکستان چلا تھا۔ ایک پوٹلی ہمہ وقت اس کے کمرے کے داہنے کونے پہ رکھے صندوق میں پڑی تھی جس میں اس کے کرتی کے تین جوڑے اور ایک کنگھا رکھا تھا۔ یہ وہ کل جائیداد تھی جو لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا مالک، کرپا شنکر کے ونش کا اکلوتا سپوت اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔ اسے بس انتظار تھا کہ کب خدا بخش اور اس کے گھر والے یہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ حالات دن بدن سنگین ہوتے چلے جائیں گے اس لیے چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہاں سے چلا جائے لیکن اس کے لیے خدا بخش کے باپ کو اکسانے کی ضرورت تھی جو ابھی تک اس لیے رکا بیٹھا تھا کہ فساد کی تپش اس کے گھر کی



دیواروں کو نہیں پہنچی تھی۔ اسے خوش فہمی تھی کہ نسل در نسل ساتھ رہنے کی بنا پر کوئی ہندو یا سکھ ایسے ہی نہیں ان پہ ہاتھ ڈال دے گا۔ کوئی لحاظ مروت ناپید تو نہیں ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ درندگی انسان کے اندر چھپی وہ وصف ہے جو تب تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک انسان انسانیت کا شرف نا کھو دے۔ ہتھیاروں کی چمک نا دیکھ لے، خون کی ہولی کی للکار نا سن لے۔

☆......☆......☆

دیپک لال ہاتھ میں تھالا پرساد گائے کو کھلانے کے لیے باڑے کی طرف جا رہا تھا۔ جب اس نے لکڑی کے پھاٹک سے ٹیک لگائے پیروں کے بل بیٹھے حویلی کے دو ملازمین تھورام اور بجرنگ کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا۔

"اس شنی وار کو تمام مسلمانوں کو خون میں نہلا دیویں گے۔ جتنے بھی نکل لیے بس نکل لیے۔ گھور پاپ ہو گیا یہ ہمار سب سے کہ اتنے سب موسلوں کو بنا کاٹے جانے دیا لیکن بو وت ہوا۔ اب ایک بھی ناہی بچے گا۔ شنی وار کی رات شکتی جتھا لے آئے گا، تے سبھی ہتھیار تیز کر لیجیو۔ گاڑی تک ناہی پہنچنے دیویں گے ان موسلوں کو۔ بیچ ماہی ٹکڑے کر دیویں گے۔" دیپک لال الٹے قدموں سے واپس ہو لیا تھا۔ اس نے بنا تاخیر کے حرف بہ حرف امام جی کو جا بتایا تھا۔ راتوں رات امام جی نے سب مسلمان گھروں کے مردوں کو مسجد میں اکٹھا کیا اور پاکستان ہجرت کرنے کا حتمی دن طے ہو گیا۔ شنی وار آنے میں ابھی پورے چار دن پڑے تھے اور بیچ کے تین دن میں علاقہ خالی کیا جا سکتا تھا۔ تین میل پیدل چل کر پٹری دکھائی دیتی تھی۔ وہاں سے گاڑی پاکستان جاتی تھی۔ اس میں سوار ہو کر یہ قافلہ نکل سکتا تھا۔ گاڑی میں پاکستانی فوجی ہتھیاروں کے ساتھ موجود ہوتے اس لیے سوار ہونے کے بعد خوف نا تھا لیکن پٹری تک پہنچنے کا جو تین میل کا سفر تھا وہ پر خطر بھی تھا اور جوکھم بھرا بھی۔ راستے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سکھ بلوائی حملہ کرتے یا ہندو بھکشوؤں کے للکاریں مارتے اور کرپانیں چمکاتے جتھے جھنجھوڑ ڈالتے۔ سب قسمت پہ منحصر تھا لیکن یہیں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ رہنے کا سمے بیت گیا تھا۔ ماحول میں تناؤ کافی دنوں سے محسوس ہو رہا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کے رویوں میں واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ سب جو ایک ساتھ ہنستے بولتے اور سکھ دکھ کے شریک رہا کرتے تھے اب تنفر سے منہ پھیرنے لگے تھے۔ مسلمان کھسیائے ہوئے پھرتے تھے۔ ہندو، سکھوں کی دکانوں سے راشن ملنا بند ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی دکانوں کی بکری ختم ہو گئی تھی۔ کھانے کے لالے جان کو آنے والے تھے، کسی کافر میں اگر ہمدردی تھی تو وہ راشن خرید کے مسلمانوں کو فراہم کر دیتا لیکن کب تک۔ سب اتنے چوکنے تھے کہ تلی کی چاپ بھانپ رہے تھے یہ تو پھر مسلمان کے منہ کا نوالہ تھا۔ پہرے داری شروع ہوئی تھی کہ کسی دکان سے کھانے پینے کا سامان مسلمان کے گھر نا پہنچنے پائے۔ عجب سخت ترین دن تھے، نا دن اترتا تھا نا رات گزرتی تھی۔ سحر ہوتے ہی خوف آنکھوں میں چھلانگ لگائے داخل ہوتا اور سب کی سانسیں ساکن کیے رکھتا۔ شام ڈھلتی تو وہی خوف موت کی شکل اوڑھ لیتا جو زیادہ ڈراؤنا لگتا تھا۔

دیپک لال کی پوٹلی پوری طرح تیار تھی۔ وہ مرنے مارنے سے واقف نہیں تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ تھورام اور بجرنگ سب کو ماریں گے۔ شاید چماٹ ماریں گے زور زور سے یا ذہن میں ان چھریوں کا تصور ابھر آتا جو باڑے میں کونے میں پڑی رہا کرتی تھیں۔ حالانکہ اپنے کانوں سے سب سن چکا تھا پر دل کو اعتبار نہیں تھا کہ کاٹ ڈالنے کا مطلب کاٹ ڈالنا ہی ہوتا ہے۔ چیر دینے کا مطلب دو ٹکڑے کرنا ہی ہوتا ہے۔ خون کی ہولی جسموں کو کاٹ چیر کے کھیلی جاتی ہے نا کہ ست رنگی برادہ اڑا کے۔ وہ حویلی کی صورت حال پر اپنی سی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جانتا تھا کہ اس کا باپ بھی مسلمانوں کا پکا دشمن ہے۔ وہ بھی یقیناً کوئی نا کوئی سازش ضرور رچے گا۔ وہ روک کسی کو نہیں سکتا تھا لیکن چوکس تھا تو محض یہ سوچ کر کہ اس کی دی گئی کوئی خبر مسلمانوں کے کام آ سکتی تھی۔

وہ اپنے باپو اور مائی کے ساتھ رسوئی میں بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چوکیوں پہ وہ دونوں باپ بیٹا سامنے کھانے کا تھال رکھے ہوئے تھے۔ دیپک لال کے حلق میں نوالے پھنس رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کتنے دن سے کئی مسلمانوں کے گھروں میں چولہا نہیں جلا۔ خدا بخش بھی کل پرانی حویلی کے پاس سے دیپک لال کے ہاتھ سے بیرا اٹھنے کروا کے گھر لے کر گیا تھا۔ اناج ختم ہو چکا تھا اور ہجرت سر پر کھڑی تھی۔ دیپک لال من ہی من حساب لگا رہا تھا کہ وہ گودام میں رکھی دو بوریاں بھی اگر مسلمانوں کے قافلے کو فراہم کر دے تو آسرا ہو سکتا تھا۔ مسلسل اس کی مائی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے فکرمند سی تھی۔ وہ شوہر اور بیٹے کو کھانا پروس رہی تھی اور خود اسے بعد میں کھانا تھا۔ یہی اس کا وتیرہ تھا۔ دیپک لال کے من میں کیا چل رہا تھا وہ یہ تو نہیں جانتی تھی لیکن اتنا ضرور بتا تھا کہ وہ خدا بخش کو ہی سوچ رہا تھا۔ اب سے آ گیا تھا کہ اسے خدا بخش سے دور رہنے کی عادت پڑ سکے اسے دمہ کا دورہ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی بیماری کافی سنبھل چکی تھی۔ حالات جو ہو چکے تھے ایسے میں خدا بخش کے سائے سے بھی بچنا لازم تھا۔ اس نے محض اس کے دل میں ڈر بٹھانے کی خاطر شوہر سے پوچھا۔

”اے جی ..... یہ ہمار علاقے ما جتنے بھی مسلمان ہیں او سبھی کا یہاں سے جاون کا ارادہ بن گئو ہے۔ گھور خوشی ہے ہمار من ما تو پاپ دھل جائیں گے ہمار۔ بس یو یہاں سے جاویں تو ہر طرف شانتی ہو جاوے گی۔“

”نکال گئی ہے کے۔“ کرپا شنکر نے اسٹیل کے گلاس سے تھال کے آگے انگلیوں پر پانی گراتے ہوئے انہیں صاف کیا اور بیوی کی ناسمجھی پہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”پاپ تو تب لاگے گا جب یو سب کے سب یہاں سے جندہ نکل جاویں گے۔ ان راذوں کی قبریں یہیں کھودیں گے۔ یہیں دفنا کے مٹی ڈالیں گے سبھی پہ لیکن پہلے کاٹ چھیل کے تہ کاری بنا دیں گے اس کے بعد۔“ وہ ہنسا اور پھر بیوی کی کم عقلی پہ سر مارتا ہوا اپنی لنگی سنبھالتے وہاں سے نکل گیا تھا۔ دیپک لال کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ میں تھا نوالہ جوں کا توں رہ گیا تھا تو کیا اس کا باپ اسے بھی مار ڈالے گا۔ وہ بھی تو ان کے ساتھ جا رہا تھا لیکن وہ تو پکڑا جائے گا۔ پہچانا جائے گا تو کیا وہ پاکستان نہیں جا پائے گا، پر سب سے پہلے ضروری تھا سب کو خطرے سے خبردار کرنا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں نوالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا جب اس کی ماں نے اسے ٹوک دیا۔

”دیپو کے سوچ رہا ہے، کدھر رہتا ہے تھارا دھیان؟ جب دیکھو تھے گم صم سا سب کو تکتا رہتا ہے۔ کیا مائی کو نہیں بتاوے گا کہ کاں سوچتا رہتا ہے۔ تھے خدا بخش کے جانے سے اداس ہے ناں، دیکھ دیپو تھارے کو اچھے اچھے دوست مل جاویں گے۔ برہمن ہندو، اونچی جاتی کے، تھے اوس خدا بخش کا دھیان من سے نکال کیوں نا ہی دیتا۔ تجھے شوبھا نہیں دیتا کسی نیچ جات کو من ما جگہ دے کر اسے میلا کرے۔ چل سا باس کھانا کھا اور سو نے جا تھاری موسی بھی آن والی ہے تین دن تک۔ او آ جائے گی تو تھارا بھی دل لگ جائے گا۔“ وہ کچھ پل دکھ سے ماں کو دیکھتا رہا۔ اسے اگر یہاں سے جانے کا دکھ تھا تو محض اپنی ماں کی وجہ سے۔ وہ اسے یاد آتی اور بے حد آتی لیکن جب وہ اللہ کے بارے میں سوچتا تو جیسے ہر جذبہ بھربھرا جاتا، مٹی بن جاتا۔ اس کی ماں اور بھی کچھ بول رہی تھی لیکن دیپک لال کا دھیان ہی نہیں تھا اس کی طرف۔ وہ اب بس ہجرت کی سوچ رہا تھا۔ دھیان اسی کے گرد گردش کر رہا تھا۔ یہاں سے نکلنا تھا اور چلے جانا تھا۔ اسے مسلمان کے طور پر زندگی گزارنی تھی اور یہی اس کا اٹل فیصلہ تھا۔

☆.....☆.....☆

شام ڈھلنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ امام جی اور حکیم برکت اللہ اس وقت خدا بخش کے چھوٹے سے مٹی کے مکان کے صحن میں بیٹھے تھے۔ چند اور بزرگ بھی وہیں موجود تھے جو قریب ہی رہنے والے مسلمان گھرانوں کے سربراہان تھے۔ چار چار پائیاں چوکور انداز میں پڑی تھیں اور ان پر وہ سب بیٹھے حالات کی سنگینی پر بحث کر رہے تھے۔ آوازیں نیچی تھیں لیکن اتنی نہیں کہ قریب کھیلتے خدا بخش اور دیپک لال کے کانوں تک نا پہنچ پاتیں۔ تھوڑی فاصلے پر وہ دونوں کچے فرش پر آڑی ترچھی ڈبے بنا کے گوٹیاں کھیل رہے تھے۔ دیپک لال تھوڑی دیر میں حویلی واپس جانے والا تھا جدھر سے وہ پنڈت جی کے بیٹے کے ساتھ کھیلنے کا بہانہ کر کے سیدھا یہاں آ گیا تھا۔ خدا بخش اور اس کے باپ کو ساری بات بتانے کے بعد امام جی کو بلایا گیا اور پھر کچھ ہی دیر میں معتبر افراد یہیں اکٹھے ہو گئے اور حتمی فیصلے کے بعد اب یہ محفل برخاست ہو رہی تھی۔ تبھی خدا بخش کے ہمسائے میں رہنے والے اکرم اللہ کی نگاہ دیپک لال پہ ٹھہر گئی۔ وہ چند پل اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور پھر بولے تو آواز بے حد دھیمی تھی۔

”عنایت ... تھارے کو یقین ہے ناں کہ یو چھورا جھوٹ نا ہی بولت ہے۔ یو نا ہو کہ ہم سب کا مروائی دے۔ ہے تو ہندو کا چھورا ناں۔ اس کا کا اعتبار۔“ انہوں نے خدا بخش کے باپ کو مخاطب کیا لیکن دیکھا سب کی جانب تھا۔ امام جی نے پہلو بدلا اور قدرے توقف سے سوچ سوچ کر بولے۔

”فکر نا ہی کرو اکرام اللہ۔ دیپک لال دل کا بہت صاف ہے۔ او ہمار سب سے محبت کرتا ہے، کبھی بھی ہمرا نقصان نہیں کرے گا جو تو خبر اس کی لائی ہووے تو کھری ہووے اور اب ہم سب کو یہاں سے راتوں رات نکلن کی کرنی ہے۔ اس سے پہلے کہ بلوائی سب خون ماریں۔“ برکت اللہ حکیم نے بھی امام جی کی بات کی فوری تائید کی تھی۔ وہ دیپک لال کی خدا بخش سے محبت کے چشم دید گواہ تھے۔ امام جی چاہتے تو انہیں بتا سکتے تھے کہ یہ بچہ مسلمان ہو چکا ہے لیکن ان کو موقع نہیں مل پایا تھا اور اب یہ لازم ہو گیا تھا کہ کسی نا کسی طرح سفر کے دوران سب کو بتانا ہو گا کیونکہ دیپک لال کو ساتھ لے جانے کی ذمہ داری انہوں نے لی تھی۔ خدا بخش اور دیپک گھر سے باہر نکل گئے اور اب دیپک دبی آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

”بخشو..... کل مالا اپنی پوٹلی تھارے مکان میں چھپا دوں گا۔ تھے اس کا دھیان رکھیو کہ کسی کے ہاتھ نا لاگے، گھر تو مائی ہر وقت مارے گھر کے چکر کاٹت ہے۔ جو تو پوٹلی پکڑی گئی تو بہت گڑبڑ ہو جاوے گی بخشو۔“

”تھے فکر متی کر اجمد۔ تھے وہاں تے داری ہووے ہے۔ تھاری حفاظت جان سے بڑھ کر کروں گا۔“ خدا بخش نے اس کے ہاتھ تھام کے عقیدت سے کہا تھا۔ وہ اس سے متاثر تھا۔ اس کی ہمت اور لگن اسے رشک میں مبتلا کرتے تھے۔ جب سے وہ مسلمان ہوا تھا اس سے محبت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اور اس کے گھر والے اور امام جی جانتے تھے بس کہ دیپک لال ان کے ساتھ پاکستان جانے والا ہے۔ امام جی نے سختی سے منع کیا تھا کہ اس بارے میں کسی کو بھنک بھی نا پڑے ورنہ سب مارے جائیں گے۔ وہ سب اب چپ چاپ ہجرت کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جس دن معتبر حضرات کی جانب سے عندیہ مل جاتا سب نکل لیتے۔

مسلمانوں نے اپنے اپنے گھروں میں ہتھیار رکھے کر رکھے تھے تاکہ بلوائی شب خون ماریں تو ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ روز دن میں تین چار بار سب کسی نا کسی کے گھر اکٹھے ہوتے اور نکلنے کی ترکیب طے کی جاتی۔ حویلی میں رہنے... لال حالات حاضرہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور مقدور بھر اطلاع بہم پہنچا دیتا۔ کرپا شنکر الگ کھٹک رہا تھا۔ ایک مخصوص سی خاموشی نے جیسے سارے علاقے کو گھیر رکھا تھا یوں جیسے دیگ کو دم آیا ہوا تھا۔ حویلی میں مشٹنڈے غنڈے جمع ہوتے تھے اور کرپانیں، برچھیاں، تلواریں تیز کی جاتی تھیں۔ کوئی دم جاتا تھا کہ ہلا بول دیا جاتا۔ رکاوٹ تھی تو یہ کہ ہندوستانی فوجی گشت پر تھے اور فساد سے بچنے کے لیے ممکنہ حد تک ہجرت کرنے والوں کی مدد بھی کر رہی تھی۔ جیسے ہی ان کا گشت ختم ہوتا یہاں مسلمانوں کا صفایا شروع ہو جاتا۔ دوسری طرف اسی موقع کا فائدہ مسلمان اٹھانا چاہ رہے تھے۔ وہ فوجی جوانوں کی یہاں موجودگی کے دوران نکل لینا چاہتے تھے اور طے یہ پایا تھا کہ اگلی رات یہاں سے تین ٹولیوں کی شکل میں قافلہ نکلے گا۔ پہلی

ٹولی میں بوڑھے مرد، عورتیں اور شیر خوار بچے ہوں گے جن کے ہمراہ تھوڑے سے جوان مردوں کا حفاظتی ٹولا ہوگا۔ ان سے کم از کم دو کلو میٹر کے فاصلے پر دوسری ٹولی ہوگی جس میں جوان عورتیں اور لڑکیاں ہندو عورتوں کا لباس پہنے ہوں گی تاکہ پہچانی نا جائیں۔ ان کے ہمراہ چھوٹے بڑے بچے اور ایک حفاظتی ٹولا ہوگا۔ سب سے پیچھے باقی تمام مرد حضرات ہتھیاروں کے ساتھ چلیں گے اور حفاظت کی غرض سے سب سے پیچھے رہیں گے۔ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد مسئلہ دیپک لال کا تھا کہ وہ حویلی سے کیسے نکلے۔ اس کے لیے حکیم برکت اللہ کام آئے۔ دیپک لال کو دمہ کا دورہ پڑا تھا اور وہ سرخ قندھاری انار بنا ہانپ رہا تھا۔ سانس نا باہر آتا تھا نا اندر جاتا تھا۔ اس کی ماں کی بدھی شل ہوگئی اور اس نے نا کرپاشنکر سے پوچھے حکیم برکت اللہ کو بلوا بھیجا۔ حکیم صاحب پہنچے اور دیپک لال کا معائنہ کرنے کے بعد صاف کہہ دیا کہ بچے کو ان کے مطب چھوڑ دیں رات بھر کو ورنہ جان کی بازی ہار جائے گا۔ وہاں ان کے پاس ایسی جڑی بوٹیاں ہیں جن کو سنگھا کے اور پلا کے دوا دیتے ہیں۔ چونکہ کرتے ہیں لیکن ابھی کچھ حویلی لانا ممکن نہیں۔ دیپک کی ماں وہموں کی ستائی ہوئی فوراً تیار ہوگئی۔ کرپاشنکر کی سواری حویلی کا پھاٹک عبور کر کے اندر آکر رکی تو حکیم برکت اللہ دیپک لال کو پالکی میں ڈالے مطب لے جا رہے تھے۔ کرپاشنکر غضب ناک ہوتے ہوئے دھاڑا تو دیپک کی ماں اس کے پیروں میں آگری۔ بیٹے کی جان کے واسطے دیے اور حکیم برکت اللہ کی مجبوری کا بتایا۔ کرپاشنکر نے پالکی میں جھانک کے بیٹے کی حالت دیکھی تو وہ نیلا پیلا ہو رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ رنگت نیلی سے جامنی ہوتی چلی گئی۔ خود بھی ہمراہ ساتھ ہی مطب روانہ ہوا اور سوچا رات بھر وہیں رہے گا۔ حکیم برکت اللہ اس کے ٹھہرنے سے پریشان ضرور تھے لیکن اللہ پہ بھروسہ کیا تھا۔ بستر پر لٹانے علاج کی ترکیبیں لڑاتے رہے۔ کرپاشنکر کا دماغ اس فسادی جانب اٹکا تھا جو بس کل یا پرسوں ہی برپا ہونے کو تھا۔ خون کی ہولی کھیلی جانی تھی اور آسمان مسلمانوں کے خون سے رنگ دیا جانا تھا۔ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور آکر کرپاشنکر کے کان میں پھسپھسایا، کرپاشنکر کے ماتھے پہ تیوریاں پڑیں اور چیں بہ جبیں ہوتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"حکیم جی ہم کا ایک جروری کام آئی گیا ہے، جانا پڑے گا، تھارے مطب پہ رام داس کو بٹھا کے جا رہا، جیسے ہی ہمار چھورا ٹھیک ہو جائے اطلاع دے دیجیو۔ پو پھٹن سے پہلو ہمار چھورا حویلی پہنچ جانا چاہیے۔" کڑک اور رعب کرپاشنکر کے لہجے سے عیاں تھا جیسے اسے معلوم تھا کہ اب نا عزت کرنے کی حاجت تھی نا مروت نبھانے کی ضرورت۔ ایک رات تھی سب کے پاس اور قصہ کہانی ختم۔ ہندو راکشسوں نے تباہی رقم کر رکھی تھی اس پہ عمل ہونا باقی تھا۔ جیسے ہی کرپاشنکر وہاں سے نکلا دیپک لال بھلا چنگا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم برکت اللہ اسے اور وہ حکیم برکت اللہ کو افسردگی سے دیکھنے لگے۔

"تم فکر ناہی کرا احمد۔ تمارے کو نکال لیں گے یہاں سے۔ اللہ سب بنان والا ہے۔ اب تم مسلمان ہووے اور مسلمان مصیبت سے گھبراوت ناہی۔"

"نا گھبرا نا نہیں حکیم جی۔ ہمار جان اور مال سب حاجر ہے دین کا واسطے۔ امام جی کی باتیں احمد بھولا نہیں کہ مسلمان کا جان اور مال دین کی خدمت واسطے ہوت ہے۔" حکیم برکت اللہ نے بے حد فخر سے اسے دیکھا تھا۔ وہ نو سال کا بچہ بہت سے بڑوں سے زیادہ بڑا تھا۔ بہت سے عقل والوں سے زیادہ شعور رکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر انہیں اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ یہاں سے دیپک لال کا نکل کر پاکستان پہنچنا بظاہر ناممکن دکھتا تھا کیونکہ اس کا پہچانے جانا بے حد آسان تھا۔ حویلی سے نکال کر یہاں تک تو لے آئے تھے یہاں سے قافلے میں شامل کرنا خاصا دشوار تھا۔ آج رات مسلمانوں کا ہجرت کرنا طے ہوا تھا۔ حالات اس قدر پیچیدہ اور سنگین تھے کہ اب کوئی پل خطرے سے خالی نہیں تھا۔ باہر ہر طرف ہندوؤں اور سکھوں کے ہرکارے پھر رہے تھے۔ کرپاشنکر جاتے



جاتے دو بندے مطب کے باہر بھی بٹھا گیا تھا۔ حکیم برکت اللہ کے مطب کے پچھلی جانب ایک بند دروازہ تھا جو ہمیشہ بند رہنے کی وجہ سے کبھی کسی کی نگاہوں میں نہیں آیا تھا لیکن آج رات انہیں اس کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ اس سے پہلے انہیں دیپک لال کے لیے کسی مسلمان بچے کے لباس کا انتظام کرنا تھا۔

☆.....☆.....☆

کرپاشنکر کی حویلی میں اس سے وحشت چکرا رہی تھی۔ باڑے سے متصل بڑے گودام کے باہری صحن میں وحشت ناک چہرے لیے ہندو اور سکھ بلوائی موجود تھے۔ خون بہانے کو بیتاب، چیرنے، کاٹنے کو بیقرار سب کے سب اس وقت جنگل سے آئے درندے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑی بڑی مشعلوں کے بیچ میں دائرے کی شکل میں بیٹھے یہ سب مسلمانوں پہ دھاوا بولنے والے تھے۔ اندر کی خبریں یہاں بھی پہنچ رہی تھیں کہ مسلمان رات میں ہی یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ اب مزید انتظار کرنا بے وقوفی ہوتی۔ ایک بھی مسلمان زندہ نکل جاتا تو قلق کبھی ختم نا ہوتا۔ کب سے تو ان کا خون بہانے کی حسرت دلوں میں پنپ رہی تھی جسے دبا رکھا تھا۔ بہلا رکھا تھا۔ وہ حسرت نکالنے کا دن آن پہنچا تھا۔

"دیکھو بھائی لوگو....." کرپاشنکر کی سرسراتی آواز سب کے کانوں میں پڑی۔ "آج کی رات ہمار جندگی کی بوہت اہم رات ہے۔ آج ہم بلی چڑھاویں گے ان مسلمانوں کی اپنے بھگوان کے چرنوں ما۔ ایک بھی یہاں سے بچ کے نکل گیو تو ساری عمر ہم خود کا معاف نہیں کر سکت ہیں۔ دیکھو نتھو تھے بات سن ہمری۔" اس نے نتھو رام کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل تھارے کو مسلمان عورتوں اور بچوں کو گھیر کے جندہ مندر کے پچھواڑے کھوئی کے پاس لانا ہے۔ باقی تھارے کو چرن داس سمجھا دیوے گا۔ پر یو موقع جائع متی کیجو۔ مردوں کو کاٹ دینا۔ عورتیں اور بچے کھوئی کے پاس لے آنا۔ عورتوں میں سے جو تو تھارے کو پسند آوے اسے دھر لیجو باقیوں کو نرک میں بھیج دیجو سمجھ گئو نا تھے۔" نتھو رام نے اپنی منڈی اس زور سے ہلائی کہ بالوں کے اوپر بندھی چھوٹی سی چٹیا الٹی کتے کی دم جیسی لگی۔ مزید کچھ وقت یہ میٹنگ جاری رہی اور پھر تمام بلوائی اپنی لنگیاں کھیسے کس کے باہر نکل لیے تھے۔ رات کے اندھیروں میں مشعلوں کی روشنی میں چمکتی تلواریں اور کرپانیں دیکھ کے کسی کا بھی دل دہل جاتا۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور کرنی کرموں کا حصہ بن کے جان چھوڑتی ہے۔ حکیم برکت اللہ پچھلے دروازے سے جا کر کسی بچے کا جوڑا پکڑ لائے تھے۔ دیپک لال بھی لنگی باندھتا تھا اور یہ اس علاقے کے برہمن بچوں کی پہچان تھی۔ باقی جاتی کے بچے ایسا لباس زیب تن نہیں کرتے تھے اس لیے دیپک کا لباس بدلنا از حد ضروری تھا۔ حکیم برکت اللہ نے اسے شلوار قمیص پہنا کر ہاتھ میں کڑا ڈالا۔ کرپان اس کی کمر سے باندھی۔ سر کے بالوں کو سمیٹ کے چھوٹی سی سکھوں سے مشابہ پگڑی پہنا دی۔ آنکھوں میں سرمے کی موٹی موٹی سلائیاں پھیر کے اس کی شکل کو مقدور بھر تبدیل کرنے کی کوشش میں کافی کامیاب ہوگئے تھے۔ اب یہاں سے نکلنا تھا۔ حکیم برکت اللہ باہر آئے تو وہاں کرپاشنکر کے ہرکارے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ حکیم صاحب نے ان میں سے ایک کو جھنجھوڑا اور کرپاشنکر کو بلا کر لانے کا کہا۔ دوسرے کو کاغذ پہ دو لفظ گھسیٹ کے دیے اور کہا کہ پنساری کی دکان کھلوا کے یہ دوائیں لا دے، دیپک لال کے لیے لازمی ابھی چاہئیں۔ ان دونوں کے جانے کے بعد حکیم برکت اللہ نے اندر کا رخ کیا اور مطب کے ساتھ ملحقہ رہائشی حصے سے گھر کے افراد کو نکالا اور اس مقام پہ روانہ کیا جہاں سبھی مسلمانوں کو قافلے کی صورت جمع ہونا تھا۔ کرپاشنکر کے آدمیوں کے بیٹھے ہوئے یہ ممکن ہی نا تھا اور سبھی لوگ پچھلے دروازے سے نکلتے تو کھڑاک سے لازمی تھا کہ کرپاشنکر کے آدمی کھٹک جاتے۔ ایک ہاتھ میں لالٹین تھامے اور دوسرے میں دیپک لال کا ہاتھ، حکیم برکت اللہ رب کا نام لے کر پچھلے دروازے سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ پلٹ کے آخری افسردہ نگاہ اپنے

مطلب پڑ لی جہاں وہ مسیں بھیگنے سے پہلے کہ اپنے والد
کے ہمراہ بیٹھا کرتے تھے۔ باپ دادا سب یہیں مرے اور
دفن ہوئے تھے۔ اب باقی بچی نسل کو بچانے اپنے آباؤ
اجداد کا وطن چھوڑ رہے تھے۔ جتنی جلدی ہوسکتا تھا وہ قافلے
تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا میدان
تھا جہاں سے شمال کی طرف سفر شروع کرتے تو پانچ
کلومیٹر کے فاصلے پہ پٹڑی گزرتی تھی۔ وہاں سے بھی کو
ٹرین پہ سوار ہونا تھا۔ حکیم برکت اللہ نے قافلے پہ نگاہ ڈالی
آٹھ بیل گاڑیوں والا قافلہ کوچ کرنے کو تیار تھا۔ اپنے بچے
اور اہلیہ کو دیکھ سکون کا سانس لیا۔ ایک جگہ ذرا سی سو بیٹھ
تھا جیسے ہجرت کی صعوبت سہنا ہی مطلے پایا کہ عورتوں
اور بچوں کو آگے کیا جائے اور انہیں اگلے اور پچھلے ٹولے کے
درمیان رکھا جائے۔ ان عورتوں میں سے زیادہ تر نے
مصلحتاً برقعہ اوڑھے عورتوں جیسا حلیہ بنا رکھا تھا کہ پہچانی نا
جائیں۔ یہ ٹولہ دس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا جو
سب پاس پاس وطن کے قریب بیٹے تھے۔ باقی
عورتیں اور جوان بچیاں دوسرے دو ٹولوں میں شامل کی
تھیں۔ خدا بخش اور دیپک لال اسی ٹولے کے ہمراہ تھے
جبکہ خدا بخش کی ماں اور بہنیں دوسرے ٹولوں میں تھیں۔
یہاں تک اس کی چاچی اور ان کی دو لڑکیاں موجود تھیں۔
آٹھ تو مند مردوں کی ٹولی میں پیدل چل پڑے تھے جن
کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ حکیم برکت اللہ بھی ہمراہ تھے
کیونکہ ان کی اہلیہ اور بیٹی بھی یہیں تھیں۔ سبھی اللہ کا نام لے
کر نکل پڑے ہوئے تھے۔ ابھی کہیں کوئی نہیں ہوئی تھی
اور رفتار کو اتنا تیز ضرور رکھنا تھا کہ تہجد سے پہلے سب اس
پٹڑی تک پہنچ جائیں۔ تین بیل گاڑیاں سب سے اگلے
ٹولے کے ساتھ موجود تھیں جن میں تمام مسافروں کا
سامان رکھا گیا تھا اور وہ افراد جو چل نہیں سکتے تھے انہیں
سوار کیا گیا تھا۔ مشعلیں ابھی نہیں مصلحتاً بجھادی گئی تھیں
تاکہ کسی کی نگاہوں میں نا آیا جائے لیکن سب بھول بیٹھے
تھے کہ دشمن کئی دن سے تاک لگائے ہوئے تھے۔ شکار
کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ سب چل پڑے تھے ہاتھوں

میں تسبیحیں پکڑے اور زبان پہ اللہ کا ذکر کرتے۔ موت کا
خوف ان کے ہم قدم تھا۔ کچھ بھی، کبھی بھی ہوسکتا تھا۔
راجستھان کی ریت ان کے قدموں کے نشان اپنے سینے پہ
ثبت کیے آخری الوداعی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ صحراؤں
میں قدموں کی رفتار ہوا سے سست ہوا کرتی ہے اور ہوا نے
شکار کی بو فضا میں پھیلا دی تھی۔ خودرو جھاڑیاں یہاں قد
آدم سے کہیں ہر سو پھیلی تھیں۔ ظالم کانٹے دار جھاڑیاں، پناہ
گاہ جھاڑیاں جن کے پیچھے تم چھپا تھا۔ ہو کا عالم تھا اور
پورے چاند کی روشنی میں دور دور تک صحرا کی ریت چمک کر
ہیولوں کی شکل میں تبدیل ہوتی دل دہلا رہی تھی۔ اگلا ٹولہ
سفر طے کرتا اس جگہ سے آگے نکل گیا تھا جہاں خاص بس
عورتوں اور بچوں کی گھات لگائے مسلمڈے چھپے بیٹھے
تھے۔ حکیم برکت اللہ کی اہلیہ کو پریشانی اور خوف میں کمی کا
مسئلہ لاحق تھا ان کی طبیعت بگڑنے لگی تو حکیم برکت
اللہ نے اپنی دواؤں کا بستہ کھولا۔ بیل گاڑی پہ کافی سامان تھا
لیکن ان کی دواؤں کا بستہ موجود نہیں تھا۔ دونوں بیل
گاڑیاں نکلنے کے بعد حکیم برکت اللہ کو یقین ہوگیا کہ ان
کا بستہ پیچھے آنے والی بیل گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ چارو
ناچار اہلیہ کی بگڑتی حالت کے پیش نظر انہوں نے پیچھے
جانے کا قصد کیا۔ معاملہ بے حد خطرناک تھا۔ خطرہ مول
لینے والی بات تھی لیکن مجبوری تھی۔ خدا بخش نے ساتھ
جانے کا عندیہ دیا تو حکیم برکت اللہ سوچ میں پڑ گئے۔ کسی
جوان مرد کو ساتھ لیتے تو یہاں کمی ہو جاتی جو کہ مناسب
نہیں تھا۔ وہ خود تو چھپتے چھپاتے جا کر واپس آسکتے تھے اس
لیے یہی بہتر لگا کہ خدا بخش کو ساتھ لیں اور بستہ لے
آئیں۔ دیپک لال کا دل گھبرایا۔ وہ بھی ساتھ جانے پہ
بضد ہوا تو حکیم برکت اللہ نے بہ محبت اور نرمی سے باز
رکھا۔ اس کی پہچان چھپانے کے لیے کافی قصد کیا گیا تھا۔
بہت مشکل سے قافلے میں شامل ہوا تھا اگر وہ نگاہوں کی
زد میں آجاتا تو معاملہ بے حد گمبھیر ہو جاتا۔ خدا بخش کی چچی
نے دیپک لال کو سینے سے لگا کے تسلی دی اور اپنے ساتھ
بٹھالیا تھا۔ خدا بخش نے دیپک لال کو دیکھا تو اسے اپنی



غلطی کا احساس ہوا کہ اسے حکیم برکت اللہ کے ساتھ نہیں
جانا چاہیے تھا۔ دیپک لال کو اس کے ہونے کا آسرا تھا اور
اس کے بعد وہ حکیم برکت اللہ کو جانتا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر
کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تو اس کا گھبرانا
ناگزیر تھا لیکن اب یہ ہو چکا تھا اور حکیم برکت اللہ اس کی
بانہہ تھامے ہوئے نکلنے کو تھے۔ خدا بخش نے ڈوبتے دل
سے دیپک لال کو دیکھا جو بیل گاڑی پہ ٹانگیں لٹکائے سکڑا
سمٹا سا اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ خدا بخش
نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی اور حکیم برکت
اللہ کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ پلٹ پلٹ کے دیپک لال کو
دیکھتا رہا تھا۔ کوئی بے چینی تھی جو اسے تنگ کیے جا رہی تھی۔
یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دیپک سے ہمیشہ کے لیے دور
ہو رہا ہے۔ وہ ابہام کو جھٹکتا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے
جلد سے جلد واپس دیپک لال کے پاس لوٹنا تھا۔ فرلانگ
یا اس سے کچھ آگے ہاں بس اتنا ہی فاصلہ بنا ہوگا ابھی جب
حکیم برکت اللہ اور خدا بخش کے کانوں نے قیامت کا شور
سنا۔ حکیم برکت اللہ نے پل بھر کی دیر کیے بنا خدا بخش کو اور
خود کو ریت پہ لٹا لیا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا آسمان پھٹ پڑا تھا یا
زمین نے کھال اتار دی تھی۔ بلوائیوں کی للکاریں اور
برچھیوں کرپانوں کی چمکیں بارتی دھاریں فضا میں بلند
ہوکر سب کے کلیجے چیر رہی تھیں۔ حکیم برکت اللہ نے
اندازہ لگایا کہ آیا یہ آوازیں ان کی پشت سے ابھریں تھیں یا
سامنے سے اور جیسے ہی اندازے پہ یقین کی مہر ثبت ہوئی
وہ خدا بخش کا ہاتھ تھام کے الٹے قدموں واپس بھاگے۔
خدا بخش "دیپو... میرا یار دیپو" کی صدائیں بلند کرتا
بانہہ چھڑانا چاہتا تھا لیکن حکیم برکت اللہ نے ایسا ناممکن بنا
دیا تھا۔ وہ قریب پہنچ کے صورت حال کا جائزہ لینے پر ہی
کوئی قدم اٹھاتے۔ جوں جوں عورتوں اور بچوں پہ مشتمل
ٹولا قریب آرہا تھا، مشعلوں کی روشنی میں چلنے والی تلواریں،
نیزے اور کرپانیں دکھائی دینے لگیں۔ جوانوں کا جو گروہ
حفاظت پہ معمور تھا وہ اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتا ٹوٹ پڑا
تھا لیکن اتنی ہی تیزی سے سب کے جگر کٹتے چلے گئے

تھے۔ حکیم برکت اللہ بے دم سے فاصلے پر ہی خدا بخش
کے منہ پہ ہاتھ جما کے جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ یہاں
سے سارا منظر واضح تھا اور اس منظر نے حکیم برکت اللہ کا
وجود کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ عورتیں اور بچے ہانکے
جانے لگے تھے پرانے مندر کی جانب اور مردوں کے سینے
نیزے مار مار کے چھلنی کر دیے گئے تھے تاکہ دیکھنے والوں
پہ حالت زار دیکھ کے دہشت بیٹھ سکے۔ حکیم برکت اللہ
نے بے بسی سے اپنی اہلیہ اور دس سالہ بیٹی کو دیکھا اور خدا
بخش نے خوف سے سہا اور پھٹی آنکھوں والے دیپک لال
کو دیکھا جو اب بھی پلٹ پلٹ کے متلاشی نگاہوں سے
اس جانب دیکھ رہا تھا جہاں خدا بخش، حکیم برکت اللہ کے
ہمراہ گئے تھے۔ وہ کیا جانتا کہ خدا بخش بہتے آنسوؤں سے
وہیں چھپا اسے تک رہا تھا اور بال نوچ رہا تھا۔ بلوائی بھی
عورتوں اور بچوں کو جس سمت لے چلے تھے پیچھے پیچھے
فاصلہ رکھتے اور چھپتے چھپاتے حکیم برکت اللہ بھی چل
دیئے تھے۔ خدا بخش کو انہوں نے سختی سے منہ بند رکھنے کا
کہا تھا اس بات کا لالچ دے کر کہ اگر وہ دیپک لال کو بچانا
چاہتا ہے تو چوکس رہے اور آواز نا نکالے۔ خدا بخش کے
لیے اولین چاہ یہی تھی اس وقت۔ وہ اپنی جان کی قیمت پہ
دیپک کو بچاتا اور کر بھی گزرتا جو حکیم برکت اللہ کی آہنی
گرفت میں نا ہوتا۔ نیزوں اور برچھیوں کی نوکیں چبھو
چبھو کر تمام عورتوں اور بچوں کو پرانے مندر کے پچھواڑے
لے آیا گیا تھا۔ وہی پرانی کھوئی دیکھ کے دیپک لال کو لگا
جیسے وہ اور خدا بخش کھیلتے ہوئے وہیں بھاگ دوڑ رہے
ہیں۔ منظر نگاہوں میں ابھرتا اور معدوم ہو رہا تھا۔ خدا بخش
اسے پکارتا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ خدا بخش کے
کنچوں والی گڑوی لیے آگے آگے تھا۔ خدا بخش کھوئی کی
منڈیر پہ بیٹھا تھا اور وہ خود اس کے پاس کھڑا تھا اور خدا بخش
کے زور دینے پہ بھی منڈیر پہ نہیں بیٹھتا کیونکہ وہ خوف زدہ
ہوتا تھا کھوئی کے اندر جھانکنے سے۔ اسے لگتا تھا جیسے اندر
سانپ اور بچھو ہیں جو لپک لپک کے دیواروں پہ چڑھتے
ہیں۔ کبھی جھانکتا تو سوچتا کہ کیا ہو جو وہ اندر گر جائے۔ کیا

ہوجواسے کوئی دھکا دے دے اور پھر وہ تھر تھرا کے دور ہو جاتا۔ خدا بخش اس پہ ہنسا کرتا تھا، ابھی بھی اس کے کانوں میں خدا بخش کی ہنسی گونجی تو اپنے ہونٹ بھی مسکرا اٹھے۔ یک دم پیچھے سے کوئی تیز دھار دار سی چیز چبھی تو وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ کسی درندہ صفت نے اسے نیزے کی نوک چبھوئی تھی آگے دھکیلنے کے لیے۔ اس پل دیپک لال کو اپنی مائی کی یاد بہت شدت سے آئی۔ وہ اسے کانٹا بھی چبھنے نہیں دیتی تھی۔ ماں تھی نا تو پیار تو بے حد تھا۔ اس کی تکلیف پہ دہاسی ہوجانے والی وہ اکیلی عورت تھی۔ دیپک لال کو امام جی کا بتایا سبق یاد آیا۔

"اللہ ہمار ساتھ ستر ماؤں سے جیادہ پیار کرت ہے۔ جب جب ہم کا تکلیف پہنچتی ہے تب تب وہ مسلمان کو اجر دیتا ہے۔" دیپک لال نے زیرلب "الحمدللہ" کا ورد شروع کر دیا تھا۔ یوں جیسے گھٹن میں ایک درز سی کھل گئی تھی۔ اس کا من سکون سے بھر گیا تھا۔ وہ ابھی ہانکے جا رہے تھے کھوئی کی جانب اور اس کی زبان با آواز بلند رب کو پکارنے لگی تھی۔ مشعلوں کے گھیرے میں وہ سب عورتیں اور بچے یوں کھڑے تھے جیسے خونی درندوں کے نرغے میں بھیڑ بکریاں کھڑی ہوں۔

کچھ فاصلے پہ مندر کی فصیل کی جڑ میں اگی بے تحاشا خودرو جھاڑیوں کے پیچھے حکیم برکت اللہ اور خدا بخش چھپ گئے تھے۔ دونوں کے رنگ فق تھے اور آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی تھیں جیسے یقین کر رہے ہوں کہ جو منظر دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔ حکیم برکت اللہ کسی طرح وہاں تک تو پہنچ گئے تھے لیکن نہتے تھے اور ساتھ میں بچہ بھی تھا۔ عقل مندی اسی میں تھی کہ چپ کے بیٹھے رہیں شاید کوئی سبب پیدا ہوجائے ان سب کو بچانے کا۔ وہ مقابلہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ خدا بخش کے مچلتے پھڑکتے وجود کو بمشکل قابو کر رکھا تھا جو کسی بھی طرح خود کو چھڑا کے دیپک لال کو بچانا چاہتا تھا۔ حکیم برکت اللہ نے اسے گھٹنوں میں دبوچ کے منہ پہ سختی سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کوئی پل جاتا تھا کہ وہ اس کی گردن کی رگ دبا کے بے ہوش کر دیتے تا کہ سامنے کا روح فرسا منظر نہ دیکھ سکے جس کا حصہ ان کی اہلیہ اور بچی بھی تھے۔ سامنے خبیث بدنوں میں چھپے شیطان عورتوں کی چھانٹی کر رہے تھے۔ جوان اور قدرے صحت مند عورتوں والا گروپ الگ کیا جا رہا تھا۔ باقی سب کو کھوئی کے پاس اکٹھا کر رہے تھے۔ بچے بھی انہی کے ساتھ جمع کیے جا رہے تھے۔ فرعونیت عروج پہ تھی اور مسکینیت دم توڑنے کو تھی۔ ایسا دل خراش منظر جس بند ہونے کو تھا جس کا مرتے دم تک نشان تاریخ ثبت کر سکی۔

حکیم برکت اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ اور بچی کو کھوئی کے قریب کھڑا دیکھ لیا تھا۔ زمانہ شناس تھے، حاذق حکیم تھے، نبض دیکھ کے مرض کی جڑ تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ ظالم کے ظلم کا انداز چہروں سے جانچ گئے تھے۔ سب کے ہونٹوں پہ پھیلی بدنما خبیث مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ یہاں کیسا اندھیر مچنے جا رہا ہے۔ خدا بخش کا مچلنا بند ہو کر اب سکتے میں تبدیل ہو رہا تھا۔ دیپک لال کے زیرلب نکلنے والا اللہ اللہ کا ورد آواز پکڑ رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی سبھی نے اللہ کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ یکا یک جیسے صدائیں بلند ہونی شروع ہوئی تھیں اور انہی صداؤں نے بلوائیوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ کھوئی کی منڈیر سے سب سے پہلی ادھیڑ عمر عورت اندر پھینک دی گئی تھی۔ ایک فلک شگاف چیخ بلند ہو کر معدوم ہوئی تھی۔ اتنا بھیانک منظر تھا کہ سبھی چپ ہوگئے تھے۔ دیپک لال سمیت۔ پر اگلے پل اس سے زیادہ حیران کن تھے۔ دیپک لال نے اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرنا شروع کیں اور اس کی آواز کے ساتھ آوازیں ملتی چلی گئیں۔ ایک کے بعد ایک عورت کھوئی میں گرتی چلی گئی۔ جب حکیم برکت اللہ کی اہلیہ کی باری آئی تو انہوں نے قریب آتے کافروں کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی بچی کو سینے میں دبوچا اور خود ہی چھلانگ لگا دی تھی۔ حکیم برکت اللہ کے لبوں سے غم کی سسکاری نکل کے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھی۔ خدا بخش کے حواس برف کی طرح جم چکے تھے۔ نگاہیں بس بچوں میں کبھی دکھائی دیتے تو کبھی اوجھل ہو جاتے دیپک

لال پہ جمی تھیں اور خود کے ہونٹوں پہ حکیم برکت اللہ کا ہاتھ جما تھا۔

بچوں کو باری باری انہی عورتوں کے اوپر کھوئی میں پھینکا جانے لگا تو کھوئی کے اندر سے چیخوں کی بازگشت نے پوری فضا کو دہلا کے رکھ دیا تھا۔ بچے گھور قبر جیسے اندھیرے میں گر رہے تھے اور ظالموں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ خدا بخش کے دل سے دعا ہوک بن کے نکلی۔

”اللہ تو احمد کی جان بچالینا۔“

لیکن مشیت کچھ اور تھی۔ دیپک لال کو بازو سے پکڑ کے کھینچا گیا تو اس کا نعرہ تکبیر اس کی ہمتوں سے زیادہ بلند تھا، آواز سب حدیں توڑتی حلق سے نکلی تھی اور آخری تھی۔ دیپک لال کو منہ کے بل کھوئی میں ڈال دیا گیا۔ وہی کھوئی جس کی منڈیر تک آتے اس کا دم نکلتا تھا۔ جس کے اندر جھانکتے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ سانپ و بچھوؤں کا خوف اسے ستایا کرتا تھا۔ آج دیپک لال اس کھوئی کے اندر کھو گیا تھا۔ نتھو رام اور چرن سنگھ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہنس رہے تھے۔ عورتوں میں سے جو الگ کی گئیں تھیں انہیں چرن سنگھ نیم غشی کے عالم میں دھکیلتا وہاں سے لے جانے لگا تو یک دم ایک جواں سالہ لڑکی پلٹی اور سجھائی دینے سے پہلے بھاگتی ہوئی کھوئی میں کود گئی تھی۔ چرن سنگھ اس کے پیچھے بھاگا لیکن دیر ہوگئی تھی۔ وہ طیش کے عالم میں باقیوں پر جھپٹا تھا۔ ایک شور سا برپا ہوگیا تھا ہر طرف۔ نتھو رام نے باقی ساتھیوں کے ساتھ جلدی جلدی درختوں کی ٹہنیاں توڑنی شروع کیں۔ وہ پھرتی سے توڑ رہے تھے اور کھوئی میں پھینک رہے تھے۔ حتی کہ حتی المقدور پھینک دینے کے بعد نتھو رام نے ایک طرف پڑا کنستر اٹھایا اور اس کے اندر موجود سیال کھوئی میں انڈیلنا شروع کیا۔ حکیم برکت اللہ نے آنکھیں میچ لیں۔ یہ منظر ان کی جان نکالنے کو کافی تھا۔ جان کنی کی کیفیت تو کب سے چل رہی تھی۔ اپنی اہلیہ اور بچی کی سسکتی بلکتی حالت زار انہیں تڑپا رہی تھی لیکن وہ بے بس تھے۔ کس کس بات کو روتے۔ ان کی اہلیہ حاملہ تھی اور وہ حکیم تھے جانتے تھے کہ کیا بیت رہی ہوگی۔ نتھو نے مشعل پکڑی اور جنگلی بھینسے کی طرح بھناتا ہوا آیا اور مشعل کو سوکھی لکڑیوں سے بھری کھوئی کے اوپر پھینک دیا۔ ایک زوردار شور اٹھا تھا۔ لکڑیاں چیخ چیخ کے اچھلی تھیں۔ ایک بھانبھڑ اٹھا تھا اور بھڑ بھڑ سب کچھ جلنے لگا تھا۔ انسانی ماس کی بدبو انسانی چیخوں سے مدغم ہونے لگی تھیں۔ خدا بخش زندہ درگور ہوگیا تھا۔ اس کا یار، اس کا ساتھی اس کھوئی میں دفن، زندہ جل رہا تھا۔ یک یک یہ احساس خدا بخش کے سینے میں بھالے کی مانند اترا کہ دیپک لال کو تو دمہ ہے۔ یہ دھواں تو اس کا دم گھوٹ دے گا۔ وہ کھانس رہا ہوگا۔ اس کا سانولا چہرہ سرخ ہوچکا ہوگا۔ وہ سینہ مسلتا بےبسی سے ہاتھ مار رہا ہوگا اور پھر حکیم برکت اللہ کو اسے بےہوش کرنے کے لیے نس نہیں دبانی پڑی تھی وہ خود ہی ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ آخری منظر جو اس کی بصارت اور سماعت محفوظ کرسکی تھی وہ کھوئی سے نکلتی آگ کے شعلوں کی لپٹیں اور اس کی تہہ سے آتا انسانی بے تحاشا شور تھا۔ اس کے دیپو کی چیخیں، اس کا احمد ہجرت کی نذر ہوگیا تھا۔ وہ راہ شوق کا ننھا شہید تھا جو تا قیامت اس کھوئی میں دفن ہوگیا تھا۔

☆……☆……☆

ریان کھوئی کی کائی زدہ دیوار سے کمر ٹیکے، ایک گھٹنا کھڑا کیے اور دوسری ٹانگ اندر کو موڑے بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دادا اس سے کچھ فاصلے پہ کھوئی کی دیوار سے بایاں پہلو لپٹائے بیٹھے تھے۔ وہ رو نہیں رہے تھے لیکن ان کی آواز میں بلا کی ویرانی تھی جیسے کسی بھرے پرے میلے کو لوٹ لیا گیا ہو، نذر آتش کر دیا گیا ہو۔ ان کا وجود خالی خالی سا کھڑکھڑاتے پتے سا کانپ رہا تھا۔ ریان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں دلاسہ دیتا۔ ساری عمر دادا کو چپ کی بکل اوڑھے دیکھا تھا۔ کبھی نا ہنسے تھے نا زیادہ بات کرتے تھے، مسکراتے تھے تو ایک دکھ ہونٹوں کے کنارے بھگوئے رکھتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ انہیں کیا دکھ ہے، سوچتا تھا مزاج ہی ایسا ہے۔ کبھی کھلنڈرے پن نے کرید ہی نا کرنے دی تھی۔ آج معلوم



ہوا وہ تو سراپا غم تھے۔ سننے اور دیکھنے میں جو فرق ہوتا ہے وہی بیتنے اور بتانے میں ہوتا ہے۔ ان پہ بیتی آج انہوں نے بتائی تھی تو اسے پتا چلا کہ وہ اندر سے مردہ ہیں۔ ریان نے گردن موڑ کے انہیں دیکھا جن کی پتھرائی آنکھیں کھوئی کی اینٹوں میں کچھ کھوج رہی تھیں۔

”دادا… پھر کیا ہوا، آپ کیسے پہنچے پاکستان اور دیپک لال میرا مطلب احمد کا کسی کو پتا نا چلا کہ وہ کرپا شنکر کا بیٹا ہے؟“

”کرپا شنکر نے اپنا ونش خود سوکھی لکڑی کی طرح جلتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی نسل خود آگ میں جھونکی تھی۔ نظارہ کیسے نا کرتا۔“ فضا میں غیر مرئی نقطہ نگاہوں سے تھامتے وہ کچھ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ ان کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے جیسے کوئی ان پہ ضرب لگا رہا ہو۔

☆ ☆ ☆

خدا بخش کو جب ہوش آیا تو حکیم برکت اللہ اسے اپنی گود میں دبوچے ہوئے تھے۔ ان کے لگاتار گرتے آنسوؤں نے ہی خدا بخش کو ہوش دلایا تھا۔ جیسے ہی اس نے سر اٹھایا حکیم برکت اللہ نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ دھر دیا تھا۔ خدا بخش نے نرمی سے انہیں نگاہوں سے تسلی دی اور ہاتھ ہٹا دیا تھا۔ اس میں اب اتنی سکت تھی کہ وہ بچا کھچا دیکھ پاتا۔ اسی اثنا میں مندر کے پھاٹک پہ شور اٹھا اور کرپا شنکر چند آدمیوں کے ساتھ شور مچاتا چیخ پکار کرتا وہاں آرہا تھا۔ وہاں پہلے سے موجود بلوائیوں میں ہلچل مچی اور سب الرٹ ہوکر کھڑے ہوگئے تھے۔ کرپا شنکر کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ سانس سے گدھے جیسی آوازیں آرہی تھیں، لنگی کا سرا ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور کچھ کچے فرش پہ رل رہا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ نتھو رام اور اس کے ساتھیوں کے گریبان جھپٹنے لگا۔

”کتھے ہے مارا دیپو…… مارا دیپک…… مارے بتاؤ تھے کاں کیا اوس کے ساتھ۔ کتھے ہے وہ۔ بولو، بتاؤ مارے کو۔ دیپو… دیپو۔“ کرپا شنکر پگلائے بیل کی طرح سب سے پوچھ رہا تھا کہ دیپک لال کہاں ہے۔ وہاں موجود بھی لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ آخر ہوا کیا۔ ابھی جشن منانا باقی تھا۔ مسلمان جلا دیے گئے تھے۔ پیٹ والیاں سوکھی ٹہنیوں کی طرح کھوئی میں بھسم ہورہی تھیں۔ بچے، ان کی نسل ساتھ ہی فنا ہوگئی تھی تو اب یہ کیا نیا تماشا تھا لیکن کرپا شنکر نا کسی کی سن رہا تھا نا دیکھ رہا تھا۔ وہ بس بھاگ بھاگ کے سب سے دیپک لال کا پوچھ رہا تھا۔ تھک کے وہ کھوئی کی جانب بھاگا۔

”دیپوووووووو“ ایک دلخراش پکار تھی جو کھوئی کی دیواروں سے ٹکرا کے واپس فضا میں پھیلی تھی۔

”مارا دیپو اس ما ہے، کوئی پانی لاؤ، مارا دیپو، مارا دیپو سانس کس طرح لیوے گا۔ اومر جاوے گا، کوئی بھاگو، اونتھو پالی پکڑ یو جاؤ۔“ وہ چلا رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ دکھ، تکلیف، صدمہ ان کی کوئی انتہا تھی تو وہ کرپا شنکر تھی۔ وہ حکیم برکت اللہ تھے اور وہ ننھا خدا بخش تھا۔ کرپا شنکر کا ونش ختم ہوگیا تھا۔ حکیم برکت اللہ کا راکھ ہوگیا تھا اور خدا بخش کا سارا وجود خاک ہو گیا تھا۔ وہ کبھی بڑا ہی نا ہوسکا۔ اس کا بچپن صدمہ نگل کے اس کے اندر جم گیا تھا۔ دیپک لال کی ہڈیوں کی چٹخن اس کی روح میں ہمیشہ کے لیے سرائیت کرگئی تھی۔ ایک دیپک لال نہیں مرا تھا اس سے وابستہ بہت کچھ فنا ہوگیا تھا۔

اس کے بعد وہیں کرپا شنکر پگلا گیا۔ وہ ٹکریں مارتا تھا کھوئی کی منڈیر پہ، جب تک اس میں لگی آگ سرد نا ہوئی وہ اپنا سر پٹختا رہا تھا۔ چرن سنگھ اور نتھو رام اپنے مالک کی یہ حالت دیکھ کے سکتے میں تھے۔ کسی طرح گھسیٹ کے وہاں سے لے کے گئے تو اب پیچھے کھوئی سے اٹھتا دھواں تھا اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے بیٹھے حکیم برکت اللہ اور خدا بخش تھے۔ دونوں ان سب کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر مردوں کی طرح وہیں بیٹھے رہے تھے۔ کافی وقت بعد من من قدموں کو گھسیٹتے کھوئی تک پہنچے تو اندر جھانکنے کی ہمت دونوں میں نہیں تھی۔ کیا دیکھتے، اپنے پیاروں کی جلی ہوئی کوئلہ بنی لاشیں، ہڈیوں کی راکھ، نوحے اور چیخیں جیسے کھوئی

کے در و دیوار سے لپٹ گئی تھیں۔ حکیم برکت اللہ نے سینے میں لمبا سانس بھرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ خدا بخش نے بھی میکانکی انداز میں ایسا ہی کیا تھا لیکن اس کے لب ہلنے سے انکاری تھے۔ نگاہیں بس دیپک لال کا تصور دیکھ رہی تھیں۔ برکت اللہ جیسے تیسے وہاں سے نکل کے قافلے کے ساتھ جاتے تھے جو ایک کیمپ میں مقیم تھے۔ خدا بخش کا سارا خاندان وہاں تک سلامت پہنچ گیا تھا لیکن ان میں وہ خود ہی سلامت نہیں تھا۔ اس کی روح کھوئی کے پاس رہ گئی تھی اور جسم گھسٹتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ برکت اللہ حکیم اپنے بچے ہوئے اہل و عیال کو بھتیجے بچوں کی طرح کرلاتے رہے تھے۔ امام جی کو جب دیپک لال یعنی احمد کی شہادت کا پتا چلا تو صدمے سے گنگ رہ گئے تھے۔ وہ ننھا بچہ اتنا بہادر تھا کہ آخری دم تک کھوئی کے اندر سے شعلوں کی لپٹوں کے ساتھ اس کی اللہ اکبر کی پکار باہر آتی رہی تھی۔

پاکستان پہنچ کے سب دھیرے دھیرے بسنے لگے تھے۔ دلوں کا درد چھپائے اور بھلائے زندگی گزارنے کا سامان کرنے لگے تھے۔ خدا بخش کے باپ کو یہاں نوکری مل گئی تو گھر کی دال روٹی وہاں سے اچھی چلنے لگی لہٰذا وہ بہت خوش تھا۔ سبھی خوش تھے سوائے خدا بخش کے جسے خوشی کا مفہوم بھول گیا تھا۔ وہ دن گزارتا اور رات بھر آنکھیں پھاڑے کھلے آسمان کو تکتا رہتا، ستارے گن گن رات بسر کرتا اور صبح پھر ویسی ہی روٹین شروع ہو جاتی۔ گزرتا وقت اس کے لیے مرہم کی بجائے کھرنڈ بنتا گیا جسے بس چھیڑنے کی دیر چاہیے تھی۔ وہ سراپا زخم تھا۔ جوان ہوا لیکن اس کی چپ کوئی شے نہ توڑ سکی۔ روزگار کے لیے شہروں شہروں گیا پر دل کا غبار نہ چھٹا۔ گھر والوں نے شادی کی کہ بدل جائے گا پر وہ سال بھر میں اللہ کو پیاری ہو گئی تو دوبارہ خدا بخش نے نام بھی نہ لینے دیا بیاہ کا۔ بچارہ نا چپ چپ گھومتا رہتا۔ بھائی بہنیں سب بیاہے گئے۔ سر میں بڑھاپے کی گرد بیٹھ گئی تو تھک گیا اور بڑے بھائی کے پاس ہی رہنے لگا۔ کمائی اب بھی آتی تھی سو کسی کو اعتراض نہیں تھا بلکہ فائدہ ہی تھا۔ ریان اس کے بڑے بھائی کا پوتا تھا جو گھر میں اس سے سب سے زیادہ قریب تھا حالانکہ خدا بخش باتیں نہیں کرتا تھا لیکن ریان کو اپنے چھوٹے دادا کی شخصیت کا اسرار تجسس میں مبتلا رکھتا تھا۔ وہ ان سے قریب ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ اسے ان کے اندر چھپے غم کا اندازہ تو ہوا لیکن وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ کس کو یاد کر کے غم زدہ رہتے ہیں۔ وہ کبھی کچھ بتاتے ہی نہیں تھے۔ وہ انہیں اکسانے لگا کہ ہندوستان چلیں۔ دادا ہتھے سے اکھڑ گئے کہ وہ ہرگز نہیں جائیں گے۔ ایک طویل عرصہ گزرا اور ایک دن چھوٹے دادا نے خود اسے آ کر کہا کہ وہ ہندوستان جانا چاہتے ہیں۔ ریان نے فوراً بھاگ دوڑ شروع کی اور اپنے دوست سے رابطہ کیا جس کے والد کے ایمبیسی میں تعلقات تھے۔ زیادہ دیر نہیں لگی اور انہیں ویزہ مل گیا تھا۔ چھوٹے دادا نے بائے روڈ جانے کا کہا تو ریان بھی اس ایڈونچر کو کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی روداد ریان کے لیے ایسی تکلیف دہ رہے گی اگر اسے اندازہ ہوتا تو وہ یہاں کبھی نہ آتا۔

☆......☆......☆

پرانا مندر، پرانی کھوئی، پراسرار دل گرفتہ فضا۔ دو "وش" یہاں کھوئی سے کمر ٹیکے بیٹھے تھے۔ دائیں جانب خدا بخش اور بائیں جانب ریان۔ ریان کس قدر رو چکا تھا اسے یاد نہیں تھا اور خدا بخش کے آنسو ساری آگ بجھانے میں مدتوں پہلے صرف ہو چکے تھے۔ ریان نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ چھوٹے دادا کا دکھ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے وہ تو سمجھتا تھا کہ ہجرت کے دوران جو واقعات اور حادثات ہوئے تھے انہوں نے ان کے ذہن کو جکڑ رکھا ہے جن کے اثر سے وہ کبھی نہیں نکل پائے۔ یہاں آ کر اس کھوئی اور اس سے منسلک دلخراش داستان نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ یہ کھوئی تھی نہیں یہ تو قبر تھی۔ اجتماعی قبر جس میں اجتماعی نسلیں دفنا دی گئیں۔ سبھی کچھ بدل گیا تھا۔ وقت، زمانہ، لوگ لیکن اس کھوئی کے نوحے اب بھی وہی دکھ کہتے تھے جو ان میں انڈیلے گئے تھے۔ ریان نے گردن موڑ کے خدا بخش کو دیکھا جو ساکت جسم کے ساتھ آنکھیں پھاڑے ہوئے تھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بول اٹھا۔

"تم پوچھا کرتے تھے ناں کہ میں ہنستا کیوں نہیں۔ میری ہنسی چلی گئی تھی ریان۔ جس وقت دیپو کو کھوئی میں پھینکا گیا تھا میرا دل بھسم ہو گیا تھا۔ بس ایک لوتھڑا سا ہے جو اب تک دھڑک رکا نہیں اور آج قرار پانے کو یہاں تک لے آیا۔ مجھے قرار آ گیا ریان..... مجھے قرار آ گیا۔"

"چھوٹے دادا..... میں سوچا کرتا تھا کہ محبت بس صنف مخالف سے زورآور ہوا کرتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کبھی کبھار ہم جنس سے محبت کا انداز سب پہ بھاری پڑ سکتا ہے۔ کوئی کسی کے لیے دنیا تیاگ سکتا ہے تو وہ اس کا ہم جنس بھی ہو سکتا ہے۔ چھوٹے دادا آپ کو دیپک لال سے ایسی والہانہ محبت تھی اور اس دیپک لال کو اللہ سے کیسی محبت جاگی دادا کہ اتنا سا بچہ، اتنا سا دل، اتنا سا جسم اس نے آگ کی نذر کر دیا۔ اتنا ڈھیر سارا ایمان تھا اس کے دل میں، مجھے فخر ہے دادا کہ میں اس داستان کا حصہ ہوں۔ میں آپ کا "وش" ہوں۔ آپ میرے لیے اعزاز ہیں۔ مجھے مرتے دم تک یہ ناز رہے گا۔" اسے لگا خدا بخش بالکل خاموش ہے۔ اس کا کلبوت ساکن ہے۔ جیسے کوئی بے جان مورت۔ وہ جواب میں ہوں ہاں بھی نہ کر رہا تھا۔ ریان کے اندر جیسے کچھ ڈوب کے ابھرا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے ہوا اور گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا خدا بخش کے قریب ہوا۔

"دادا..... دادا..... چھوٹے دادا۔" ریان نے اسے جھنجھوڑا لیکن خدا بخش ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے خدا بخش کے گالوں کو تھپتھپایا تو اس کا سر ایک طرف یوں ڈھلک گیا جیسے پرانا کچا گھڑا کنکری لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ خدا بخش کا وجود بھی تو مدتوں کا بھربھری مٹی بن چکا تھا آج ڈھے گیا تھا۔ وہ وہیں آ کے ٹوٹا تھا جہاں اس کا اور دیپک لال کا ساتھ جڑا تھا۔ اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ کے کھوئی میں اتر گئی تھی۔ ریان بلکتے ہوئے خدا بخش کا سر اپنے سینے سے لگائے منہ آسمان کی جانب کیے رو رہا تھا۔ خدا بخش کا چہرہ اور سینہ مسلتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ اس کے کرتے کی اوپری جیب کو چھوا تو اس میں کچھ کڑکڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو تہہ شدہ کاغذ تھا۔ ریان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے خدا بخش کو اپنے سینے کا سہارا دیا اور دونوں بازوؤں کے گھیرے میں اس کا سر لے کر ہاتھوں سے وہ کاغذ کھولا۔

"میرے پیارے بیٹے ریان۔ میں تمہارا چھوٹا دادا تمہیں یہ وصیت کرتا ہوں کہ مجھے اس کھوئی کے پہلو میں دفنا دینا جہاں میری قضا مجھے کھینچ لائی ہے۔ مجھے احمد نے بلایا ہے اور اس بار میں اس کی پکار کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آج تک میں اس دکھ سے نکل نہیں سکا کہ اس نے تب بھی مجھے پکارا ہوگا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ آج میں اپنے یار کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا، مجھے اس کے ساتھ ہی رہنے دینا۔ مجھے اس سے ملا دینا پیارے ریان۔ مجھے یہیں دفنا دینا۔ میری اور اس کی مٹی یہیں کی تھی۔ یہیں ملا دینا، یہیں بھلا دینا۔"

وہ دیپک لال سے جا ملا تھا تہتر سال بعد۔ بالآخر داستان تمام ہوئی، ادھوری کہانی مکمل ہوئی۔ وش برباد ہوئے لیکن نئی نسل میں محبت کی آبیاری کر گئے۔ انہیں بتا گئے کہ سرحد پار دو دل ایک سا دھڑک سکتے ہیں۔ دو دل ایک تار سے جڑ سکتے ہیں۔ ادھوری کہانی مکمل ہو سکتی ہے۔ اس دنیا میں نہ سہی اُس جہاں سہی۔

بنا کر دوست میرے چارہ گر کو
میرے زخموں کو گہرا کر دیا ہے
محبت کی گواہی دے کے تم نے
مجھے سب میں اکیلا کر دیا ہے

''مہنگائی نے تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں..... غضب خدا کا کھانا پکانے کا تیل، وہ بھی ایک پیکٹ جو ہمارے جیسے بڑے گھرانے میں بہ مشکل چھ سے سات دن نکالتا ہے، چھ سو روپے سے تجاوز کر گیا ہے، اللہ معاف کرے جس چیز کو ہاتھ لگاؤ آگ ہی لگی نظر آ رہی ہے۔'' مہتاب خاتون نے برقعہ اتار کر روم کولر کے سامنے بیٹھ کر ٹھنڈا ٹھار شربت کا گلاس حلق سے اتارا اور سامنے کھڑی مہرین کو دیکھا جو سامان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''امی اس میں جیلی کے ڈبے ہیں نہ کسٹرڈ کے اور وہ بچوں کی نوڈلز.....'' اس کے اس جملے پر مہتاب خاتون نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

''بی بی ایک کمائی ہے میرے بیٹے کی..... سارا دن محنت کرتا ہے تب کہیں جا کر شام کو پانچ سو کا نوٹ دکان کا مالک ہاتھ پر رکھتا ہے اور دوسری پنشن ہے میرے مرحوم شوہر کی جس سے بہ مشکل بجلی اور گیس کے بل ہی بھر پاتے ہیں اور تم اب یہ چونچلے ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔ یہ بریانی مصالحے اور یہ ٹشو کے ڈبے وغیرہ، بی بی کمانے نکلو باہر تو پتا چلے کہ کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔'' وہ گرمی، پریشانی اور مہنگائی کا سارا غبار بے چاری مہرین پر نکال رہی تھیں۔ وہ ''جی اچھا'' کہہ کر سر جھکائے سامان باورچی خانے میں منتقل کرنے لگی۔ دالیں بھی کم کم تھیں بس ایک بار پکتیں تو اگلی بار کے لیے ختم لیکن وہ خاموشی سے سودا سمیٹنے لگی۔ کچھ تو میکے کا وقت اتنی مہنگائی کے دور کا نہیں تھا اور کچھ وہاں تین تین لوگ کمانے والے تھے۔ ابا کی جاب تھی بہت اچھی، ایک بہت بڑے گروسری اسٹور میں تنخواہ بھی ملتی اور ایک خاص حد تک کے پیکج کا سودا بھی۔ بھائی اگرچہ شادی شدہ تھے لیکن ہر ماہ دس ہزار امی ابو کو گھر کے اخراجات کی مد میں دیتے تھے۔ امی کا گھر میں ہی لیکن اپنا بیوٹی پارلر تھا۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک پیسے کما لیتی تھیں، خصوصاً شادیوں کے سیزن اور چاند رات عید پر۔ ایسے میں گھر میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں تھی بلکہ اچھی خاصی خوشحالی تھی لیکن اب یہاں سسرال میں آہستہ آہستہ زندگی تنگ ہونے لگی تھی، کھانے پینے تک کی چیزیں پہنچ سے باہر ہو رہی تھیں۔ مہرین جس نے اپنے بہت سے شوق اور خواہشات اس مہنگائی اور محدود آمدنی کی وجہ سے دبا رکھے تھے اب روٹی سے بھی ہاتھ کھینچ لیتی۔ اسے لگتا



مہتاب خاتون کی تیز نظریں اس کے نوالے گن رہی ہیں، سودا رکھتے ہوئے آنکھیں بھیگ گئیں اور بھوک کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اوپر تلے کے تین بچوں کی پیدائش سے وہ یوں بھی بہت کمزور ہوگئی تھی۔ بڑا بیٹا طلحہ اسکول جاتا تھا اور فورتھ کلاس میں تھا۔ اس سے چھوٹی دانیہ بھی کلاس ون کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سب سے چھوٹا عبداللہ ابھی گود میں تھا۔

''کہا بھی تھا امی کو..... مجھے بھی سکھا دیں چھوٹا موٹا کام، کوئی بیوٹیشن کا کورس کروا دیں لیکن امی کی تو ایک ہی رٹ تھی۔ میری بیٹی راج کرے گی اور تو اور ایک بار سیکھ لیا تو سب سسرالی رشتہ داروں کا کام مفت کرنا پڑے گا، چھوڑو رہنے دو۔'' امی پر بس نہیں کی بلکہ ایف اے سے آگے پڑھنے بھی نہیں دیا۔ ''کتنا وقت ضائع کر دیا میں نے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے پھر سے رو پڑی تھی۔

☆......☆......☆

آج ایک مہینے بعد میکے آئی تھی، بہت خاموشی تھی امی کے پارلر میں بہت سی نئی چیزوں کا اضافہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''یہ سب کیا ہی امی، آپ کو اب کیا ضرورت ہے کام کرنے کی؟''

''اتنی مہنگائی ہوگئی ہے بیٹا..... اب تو تمہارے ابا کا اپنا اسٹور ہے اس کے باوجود گزارہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ تمہارے بھائی کے اپنے اخراجات بڑھ گئے ہیں، بچوں کی فیسیں، کپڑے، جوتے، یوٹیلٹی بل اور کیا کیا اور اخراجات ہوتے ہیں، یہ تو آمنہ (بھابی) نے بیوٹیشن کے دو تین کورسز کیے ہیں تو اب ہم دونوں مل کر کر لیتی ہیں..... آمنہ کے نئے کورسز اور میرے تجربے سے کام اچھا خاصا بڑھ گیا ہے، تھوڑی انویسٹمنٹ اس نے بھی کی ہے۔ میرے کپڑے جوتے، آمنہ کے کپڑے اور باقی بچوں کے کھلونے۔ ایسی فالتو یا اوپر کی شاپنگ تو ہم دونوں اب اپنے پیسوں سے کر لیتی

ہیں۔" امی کے چہرے پر اطمینان تھا۔ آمنہ بھی تازہ دم فیشل زدہ چہرے کے ساتھ بہت مطمئن اور خوش لگ رہی تھی۔ چائے کے ساتھ دہی بڑے اور فریش کیک دیکھ کر مہرین کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

"کاش امی آپ مجھے بھی سکھا دیتیں کچھ یا تھوڑا اور پڑھا دیتیں..... مہنگائی کا عذاب تو سب پر ہی اترا ہے، میرے گھر میں بھی یہی مسئلہ ہے لیکن آپ کے ہاں سب کما رہے ہیں اور میرے ہاں....." وہ اپنی سوچ کو جھٹک کر کیک کھانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

چھت پر کپڑے پھیلاتے ہوئے سامنے گھر کے دروازے پر نظر پڑی جہاں سلائی سنٹر کا بورڈ لگا تھا۔

"ارے عذرا خالہ کی بہو نے سلائی سنٹر بنا لیا۔" وہ خودکلامی کے انداز میں بولی، وہ کب سے سلائی سکھانا چاہ رہی تھی محلے کی لڑکیوں کو لیکن میاں کی طرف سے اجازت نہیں تھی کام کرنے کی ابھی وہ اسی سوچ میں تھی کہ عذرا خالہ بھی چھت پر مرغیوں کو دانہ ڈالنے آ گئیں، سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہ ہی تھا مہرین کا۔

"نیلو نے سلائی سنٹر بنا لیا..... اکرم بھائی نے اجازت دے دی کیا؟"

"ہاں بیٹا..... مہنگائی نے کمر توڑ کر رکھ دی..... بے چارا اکیلا اکرم کیا کیا کرتا، تو خود ہی نیلو سے کہا کہ یا کہیں سلائی کر استانی لگ جائے یا گھر میں بنا لے سلائی اسکول۔ اس نے تو شکر کیا، پرسوں سے لڑکیاں بھی آ رہی ہیں۔ سات سو روپیہ فیس رکھی ہے، ماشاء اللہ سات آٹھ لڑکیاں آ گئی ہیں اور بھی آئیں گی اور کپڑے سلائی کے لیے بھی آئے ہیں۔ سادہ سوٹ کی ہزار روپیہ سلائی ہے، تم بھی سلوا کر دیکھوں ناں۔" وہ پوری تفصیل بتانے لگیں وہ مصنوعی مسکراہٹ سے "جی ضرور" کہہ کر پلٹ آئی تھی۔

"سلائی بھی تو نہیں آتی مجھے۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے نیلو کے پاس بیس پچیس لڑکیاں ہو گئی تھیں۔ کپڑوں کے آرڈر ملنے لگے بقول عذرا خالہ چار پانچ گھنٹوں کی محنت سے مہینے میں بیس ہزار تک کما لیتی ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں یہ بیس ہزار بھی ایک سفید پوش گھرانے کے لیے غنیمت تھے۔

☆......☆......☆

وہ بچوں کو پڑھا رہی تھی جب عدیل تھکا ہارا گھر داخل ہوا۔ مہتاب خاتون نے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ عدیل نے بس پانی کا گلاس پیا اور ماں کو لے کر نکل گیا دروازہ بند کرتے ہوئے یونہی اس کی نظر عذرا خالہ کے گھر کے باہر موٹر سائیکل سے اترتے اکرم بھائی اور نیلو پر پڑی ہنستے مسکراتے چہرے..... پھل سبزیوں کی تھیلیاں اٹھائے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔

"سچ ہی کہتے ہیں ایک اور ایک دو نہیں گیارہ ہوتے ہیں اس دن کا تازہ چہرہ، امی کا اطمینان اور آج نیلو اور اکرم بھائی کی خوشحالی..... اللہ ان کو نظر بد سے بچائے آمین لیکن یہ سچ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا سہارا ہوتے ہیں، ساتھی ہیں تو پھر گھر چلانے کے لیے اگر دونوں کمائیں تو کیا قباحت ہے..... اگرچہ ایک کمائی کم ہو، تھوڑی ہو لیکن سہارا تو ہو اور پھر قطرہ قطرہ کر کے ہی بالٹی بھرتی ہوتی ہے۔ دانہ دانہ کر کے اناج کی بوری، مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے، عدیل کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیسی مرجھا سی گئی ہے ان کی شکل، ہم سب خوراک کی کمی کا بھی تو شکار ہو رہے ہیں اور امی (ساس) بھی تو سچ کہتی ہیں اپنے شوہر کی پنشن وہ گھر کی بجلی کے بل کی مد میں نکال رہی ہیں..... ہاں مجھے کچھ کرنا تو چاہیے مگر کیا..... میں کیا کر سکتی ہوں؟ کیا ہنر ہے میرے پاس، کچھ بھی تو نہیں، تعلیم....." وہ ایک بار پھر روہانسی ہو گئی۔

☆......☆......☆

"ماما....." وہ کپڑے استری کر رہی تھی جب طلحہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

"جی بیٹا۔"

"ماما..... آپ نے لنچ میں دال چاول دیئے تھے



ناں تو میرا لنچ باکس کھلتے ہی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی، سب بچے للچائی نظروں سے دیکھنے لگے اور وہ مس کائنات ہیں ناں انہوں نے تو چکھ کر بھی دیکھے، آپ کی بہت تعریف کی اور کہہ رہی تھیں کاش اسکول کی کینٹین میں دال چاول ملتے۔" طلحہ کی بات کو مسکرا کر سنتے ہوئے آخر میں وہ چونکی، اس کی بات پر غور کیا..... کیا کر سکتی ہوں ہیں؟ یونہی جیسے اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

"یہ تو سچ ہے بیٹا..... تیری ماں میں اور کوئی گر ہو نہ ہو کھانا بہت لذیذ بناتی ہے خاص طور پر دال چاول..... ٹھیلا لگائے دال چاول کا تو ہاتھوں ہاتھ بکیں۔" مہتاب خاتون نہ جانے کب اندر آئیں پہلی بار ان کے منہ سے یوں تعریف سن کر وہ کھل کر مسکرائی۔ وہ دونوں دادی پوتا ہنس رہے تھے اور مہرین کو جیسے ایک راستہ مل گیا تھا۔

بہت سوچ وچار کے بعد عدیل سے بات کی پہلے تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"کوئی کمی ہے تمہیں کیا اور بچے چھوٹے ہیں ابھی..... دانیہ تو اسکول سے بھی جلدی آ جاتی ہے اور عبداللہ تو بہت چھوٹا ہے۔" عدیل کی بات کے جواب میں اس نے سو مثالیں دے کر سمجھایا، بھابی کی، اکرم اور نیلو کی مثالیں دیں۔

"یہ جو ٹیچرز ہوتی ہیں، ڈاکٹرز ہوتی ہیں یہ سب بھی کسی نہ کسی کی بیوی، بہن، بیٹی ہوتی ہے۔ عدیل جس کے پاس جو ہنر ہوتا ہے، جو قابلیت ہوتی ہے ناں وہ اسی کو بروئے کار لا کر اپنے حالات بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت مشکل حالات ہیں صرف ہمارے لیے نہیں بلکہ ہمارے ملک کے تمام مڈل کلاس گھرانوں کے لیے جنہیں اپنی عزت کا بھرم بھی رکھنا ہے اور اس مشکل وقت کا سامنا بھی کرنا ہے۔" اس نے پیار و رسان سے اسے سمجھانا چاہا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے مہرین لیکن لوگ..... لوگ کیا کہیں گے؟"

''کون سے لوگ عدیل؟ وہی لوگ جنہیں ہم محلے دار یا رشتے دار کہتے ہیں۔ تو رشتے دار میں سب سے پہلے خود میری اپنی ماں اور بھابی کام کررہی ہیں اور محلے دار وہ عذرا خالہ کی بہو نیلو اس نے اپنا سلائی سنٹر بنالیا ہے۔''

''ہاں اکرم بتا رہا تھا کہ جب سے بھابی نے کام شروع کیا ہے بہت مدد ہو جاتی ہے۔ خوش تھا اکرم۔'' عدیل اس کی بات سمجھنے لگا تھا۔

''مسئلہ یہ ہے عدیل کہ میرے پاس نہ کوئی ڈگری ہے نہ کسی مہارت کا سرٹیفکیٹ...... میں نہ تو سلائی کرسکتی ہوں نہ بیوٹی پارلر چلا سکتی ہوں، ہاں ایک کوشش کرنے دیں، دنیا میں کوئی بھی شخص بالکل فارغ اور بے کار نہیں ہوتا۔ اللہ پاک نے ہر کسی کو کوئی نہ کوئی ہنر، کوئی نہ کوئی صلاحیت دے رکھی ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں اچھا کھانا پکا سکتی ہوں؟'' وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے محنت کش ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''ہاں بہت اچھا...... سچ بتاؤں تو تمہارے ہاتھ کے ذائقے کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے اب آگے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں...... بس میرا ساتھ دیں تاکہ میں آپ کا ساتھ دے سکوں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ عدیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھ دبائے۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں مہرین۔''

☆......☆......☆

''کھانا سپلائی کروگی، لیکن کہاں؟'' مہتاب خاتون نے گھور کر دیکھا اس کی طرف۔ وہ جو ڈسپوزایبل ڈبے لے کر آئی تھی۔ ان کی گنتی کرتے ہوئے غور سے ساس کی سمت دیکھا۔

''بچوں کے اسکول اسٹاف کا کھانا...... قریب کی مارکیٹ میں دکان داروں کا کھانا اور باہر روڈ پر ہاسپٹل میں اسٹاف کا کھانا۔ میں تینوں جگہ جا کر بات کر آئی تھی۔ آرڈر روزانہ کی بنیاد پر ملیں گے۔ گیارہ بجے تک آرڈر بک ہوں گے اور دو گھنٹے بعد ہاسپٹل اور مارکیٹ میں اور ایک گھنٹے بعد اسکول میں سپلائی کرنا ہوگا۔ تینوں جگہ سے آرڈر لینے اور پے منٹ کرنے اسکول اور ہاسپٹل کا بندہ ہی آیا کرے گا اور مارکیٹ کا کھانا عدیل جب لنچ کرنے آتے ہیں تو پے منٹ بھی لے آیا کریں گے اور کھانا بھی لے جایا کریں گے۔ آپ بس دعا کرنا رزق حلال میں بہت برکت ہوتی ہے۔'' وہ مصروف انداز میں بولی۔

''اتنا کچھ کرلیا مشورہ بھی نہیں کیا...... بتایا بھی تو اب جب یہ ڈبے شبے بھی لے آئی، یہ بھی نہیں سوچا کہ لوگ کیا کہیں گے؟'' وہی جملہ وہ مسکرادی۔

''کچھ نہیں کہیں گی لوگ...... انہیں لوگوں کے اپنے گھر میں موجود عورتیں اب فارغ نہیں بیٹھیں، ہر کوئی کچھ نہ کچھ کررہا ہے۔ وہ آپ کی سہیلی مہناز کی بیٹی انگلش کی ٹیوشن پڑھاتی ہے ہزاروں میں فیس لے رہی ہے اور آپ کے سامنے مہناز آنٹی خود کو کروڑپتی ظاہر کرتی ہیں، انہیں کیا ضرورت ہے کام کرنے کی؟ وہ کیوں نہیں سوچتیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ نہیں کہیں گے لوگ امی۔ اب لوگوں کے پاس فرصت نہیں ہے دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کی کیونکہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینا فارغ لوگوں کا کام ہے اور اب کوئی فارغ نہیں۔'' وہ آرام سے سمجھا رہی تھی، مہتاب خاتون اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

''کیا پکاؤ گی پہلے دن؟'' یک دم لہجہ بدلا تو مہرین کی ہمت بندھی۔

''وہی جو آپ کو بہت پسند ہے میرے ہاتھ کا...... دال چاول۔''

''چل پھر ٹھیک ہے...... سلاد میں بنادوں گی۔'' وہ مسکرائیں۔



''ایک پلیٹ سو روپے کی ہوگی، یہ ایک ڈبہ ایک پلیٹ کے برابر ہے، لاگت آئے گی تقریباً ساٹھ روپے کی یعنی فی ڈبہ چالیس روپے کی بچت ہوگی کل کے لیے چالیس آرڈر ہیں یعنی تقریباً سولہ سو بچت آئے گی ایک دن کی۔'' وہ سارا حساب لگائے بیٹھی تھی۔

''آرڈرز اوپر نیچے بھی ہوسکتے ہیں کسی دن کم کسی دن زیادہ اور چھٹی والے دن ہماری بھی چھٹی ہوگی۔ مارکیٹ کی جمعہ کو اور اسکول کی اتوار کو، ہاں ہاسپٹل کے لیے چھٹی والے دن بھی آرڈر تیار کرنا پڑے گا لیکن اگر آپ ہزار روپیہ روز کی اوسطاً منافع کی رقم بھی رکھیں تو امی چھٹیاں نکال کر چوبیس پچیس ہزار ماہوار منافع ہوگا اور گھر کا روز کا کھانا الگ سے پکانا بھی نہیں پڑے گا۔'' وہ بہت شوق اور دلجمعی سے بتارہی تھی۔ مہتاب خاتون نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''جیتی رہو اور اپنے اس کام میں خوب کامیابی سمیٹو۔ بے شک رزق حلال کمانا عبادت ہے۔ اللہ تمہارا مددگار ہو بیٹی، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' ان کی اس تسلی نے ماحول یک دم ہلکا پھلکا کردیا تھا۔ وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

☆......☆......☆

(ایک ماہ بعد)

آرڈر کا چکن پلاؤ اور کباب بھجوانے کے بعد وہ پے منٹ گن رہی تھی جب عدیل ہاف چھٹی لے کر آگیا تھا۔

''کل سے پانچ آرڈر بڑھ جائیں گے...... ایک دکان درزی نے لی ہے۔ بہت بڑا سیٹ اپ ہے اس کا، سلائی بھی کمال کی ہے، چار لوگ اس کی دکان کے ہیں اور ایک آرڈر ہماری مارکیٹ کے قریبی بینک کے گارڈ کا ہوسکتا ہے بینک سے بھی آرڈر آنے لگیں۔'' عدیل ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوا اور اسے تفصیل بتاتے ہوئے خوش تھا۔ وہ بھی مسکرادی۔

''جی اللہ کا شکر ہے۔''

''اچھا میں نے گروسری کی لسٹ بنالی ہے آپ چائے پی کر پھر چلتے ہیں گروسری لینے۔ ایک لسٹ تو چھوٹے بچوں کی ہے نوڈلز، جیم، جیلی'' بات کرتے ہوئے نظر مہتاب خاتون کی طرف پڑی تو زبان دانتوں تلے دبالی۔

''ہاں...... ہاں بھی ضرور لاؤ...... اللہ ان کے باپ اور ماں کی کمائی میں اور برکت ڈالے، انسان کماتا کس لیے ہے۔ کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔'' ان کی مسکراہٹ نے عدیل اور مہرین کو بھی مسکرانے پر مجبور کردیا۔ خوش حالی اور سکون کی دولت سے بھرے ہوئے دل رب کے شکرگزار تھے جس نے یہ راہ دکھائی اور کام میں برکت ڈالی۔

''کل سے دو ڈبے فالتو بنا کر دیا کروں گی عدیل...... راستے میں کوئی بھی دو مستحق لوگوں کو فری دے دیا کیجیے۔'' وہ چادر اوڑھ کر لسٹ پر آخری نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

''یہ تو بہت اچھی بات سوچی تم نے۔'' عدیل نے فخر سے بیوی کی سمت دیکھا۔

''تم صحیح کہتی تھی مہرین...... اللہ نے سب کو کوئی نہ کوئی صلاحیت دی ہے، اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس صلاحیت سے کس طرح فائدہ اٹھائیں اور یہ بھی کہ لوگ کیا کہیں گے؟ لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔ آج کل سب اپنی اپنی زندگی کی گاڑی چلانے میں مصروف ہیں۔'' بات کا آخری جملہ اکرم اور نیلو کو گروسری اسٹور سے نکلتے دیکھ کر کہا تو دونوں قہقہہ لگا کر رہ گئے تھے۔

قسط نمبر پندرہ

# مجھ کو تسلیم کیوں نہیں کرتے

## راحت وفا

اندھیرا لاکھ ہو، مجھ کو سحر کی آس رہتی ہے
یہی وہ روشنی ہے جو مجھے ڈرنے نہیں دیتی
مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

شمسو مالی نے ایسے کلمات سنائے تھے کہ اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ بی بی کے کمرے میں خود کو بند کرکے دل کا بوجھ کم کیا۔ وہ واقعی اکیلی ہوگئی تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو وہ آنکھیں صاف کرکے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ جگنو دروازے پر کھڑا کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔

"یاسمین سے کہو میرے کمرے میں لے آئے اور آپ دونوں بھی کھانا کھا کر آرام کرو۔" بڑا افسردہ اور سنجیدہ سا لہجہ تھا۔ جگنو نے جا کر بھی کچھ نہ پوچھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ کچن میں، یاسمین چائے کے برتن دھو رہی تھی، جگنو نے پھلکا بنانے کو کہا۔ ٹرے میں سالن، رائتہ، سلاد رکھا، پلیٹ، چمچ رکھا، پھلکا رومال میں لپیٹ کر یاسمین کو ہی دیا کہ وہ کھانا لے جائے۔ یاسمین ٹرے لیے کمرے میں آئی تو وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ لباس تبدیل کرچکی تھی۔

"یاسمین شمسو چاچا کا اچھے سے خیال رکھا کرو، وہ بہت دکھی لگتے ہیں۔" وہ اٹھ بیٹھی اور بولی۔

"جی..... جی بہت خیال رکھتی ہوں بلکہ جگنو بھیا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔" یاسمین نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

"اچھی بات ہے، میں پوچھوں گی اگر وہ ہمارے سرونٹ کوارٹر میں آنا چاہیں تو خالی پڑا ہے۔"

"جی کیوں نہیں آپ کا دل بڑا ہے۔"

"دن بھر ٹھیک رہا، میرا مطلب جگنو کا موڈ۔" اس نے پلیٹ میں سالن نکال کر پہلا نوالہ توڑا۔

"ہاں یاد آیا..... رکیں۔" یاسمین کو کچھ یاد آیا وہ اٹھ کر اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف گئی اور ایک سفید لفافہ نکال کر اس کے پاس آئی۔

"یہ کیا ہے؟" جگنو کا سامان سمیٹ کر صفائی کررہی تھی تو الماری کے دروازے میں تھوڑا سا کونا دبا تھا۔ الماری کا دروازہ کھول کر اٹھایا اور آپ کو دکھانے کے لیے لے آئی۔

"ارے بیوقوف اس کی الماری سے اس کا لفافہ اٹھا کر کیوں لائیں، وہیں رکھ دینا تھا۔" چاہت نے کہا۔

"آپ کو دکھانا تھا آپ کھانا کھا کر دیکھنا، اندر جگنو بھیا کی فوٹو بھی ہے۔ بالکل کوئی نئے سے جگنو بھیا۔" یاسمین نے کہا تو چاہت کو ہنسی آگئی۔

"جگنو کی فوٹو ہے یا بھوت کی۔"

"آپ دیکھنا۔"

"اچھا چلو یہ برتن اٹھاؤ اور جاؤ..... اپنے کام سمیٹو۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر سونا چاہتی ہوں۔" چاہت نے کہا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔ کچھ ہی دیر میں باہر آئی تو یاسمین سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔

"آپ کہیں تو جلدی سے واپس رکھ آؤں، جگنو بھیا کو پتا چل گیا کہ میں لفافہ لائی ہوں تو خفا ہوں گے۔"

"کچھ نہیں ہوتا، جاؤ جا کر کام ختم کرکے سو جاؤ۔" چاہت نے تسلی دی مگر اسی اثناء میں جگنو تیزی سے اندر آکر یاسمین سے مخاطب ہوا۔

"بی لومڑی..... یہاں بیٹھی ہماری شکایتیں لگا رہی ہو، کوئی کام بھی کرلو۔"

"میں کیوں شکایتیں لگاؤں گی؟" یاسمین بھی کچھ غصے اور کچھ حیرت سے بولی۔

"جگنو..... یہ کیا لڑائی ہے، کیوں شکایت لگائے گی یاسمین؟" چاہت نے مداخلت کی۔

"وہ جی بڑی دیر سے یہاں بیٹھی ہے تو ہم سمجھے....." جگنو نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

"حد ہے تمہاری جگنو..... ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔" چاہت نے کہا تو وہ کان دبا کر نکل گیا۔ یاسمین بھی ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔

☆...☆...☆
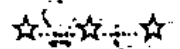
بہار چپ، خاموش مگر بے سکون تھی۔ مضطرب تھی۔ بے قرار تھی۔ سوتے سے جاگ جاتی تھی۔ تمثال کی خاموشی، سرد جدائی نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ ایک دم چونک کر اٹھی اور سینے پر ہاتھ رکھ کے لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے

ہائے وہ شخص جو نیند کی وادی میں کہیں
تیری آواز سے بیدار ہو اور تو نہ ملے

آنکھوں سے سوتے پھوٹے، دل تڑپنے لگا فون اٹھا کر اس دشمن جان کا نمبر ملایا مگر وہ آف تھا۔ مایوسی اور بے بسی کی اس گھڑی میں وہ سکتے میں تھی کہ ایسے دوری تھی کہ جیسے دنیا میں کوئی اس کا آشنا نہیں اور اس کی صرف درد سے، یادوں سے اور اشکوں سے شناسائی رہ گئی تھی۔ اس نے پھونک کر سارے احساسات کو صرف تمثال کی تمنا کی تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ خار تو خار گل بھی اس سے خفا ہیں، اس کے پیارے بابا بھی خفا اور خاموش تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب خوبصورتیاں جیسے زائل ہوگئی تھیں۔ بس آنکھوں سے پانی رواں تھا۔ تمثال اور اس کی پاکیزہ محبت کا پانی۔ تمثال کے پتھر دل سے تو جانے کب محبت کا چشمہ پھوٹے وہ تو آنسو بہا رہی تھی۔

جانے کب غلط فہمیاں دور ہوں، جانے کب تمثال اس کے روبرو آئے یہ شدید تکلیف دہ احساس تھا۔ جس کا حل بیٹھ کر ہی نکالا جا سکتا ہے مگر کیسے؟ جیسے وہ خود نہیں چاہتے کہ تمثال اور بہار کی ملاقات ہو۔ تمثال کے ابا کا لہجہ بھی اسے کافی روکھا سا لگا تھا۔ پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی ان کے لہجے میں روتے روتے وہ اللہ سے فریاد کرنے لگی۔ رات کا آخری پہر تھا تو وضو کر کے جائے نماز پر پناہ لی اور جائز پناہ لی۔ مراد دینی ہو یا دنیاوی پوری تو مالک حقیقی ہی کرتا ہے۔ جب وہ شدت جذبات سے مشکل وقت میں آگے پیچھے دائیں بائیں کسی کی راہ دیکھنے کے بجائے صرف اور صرف اللہ سے رجوع کرنا چاہیے کیونکہ جہاں انسان کا حوصلہ ختم ہوتا ہے وہاں سے رحمت خداوندی شروع ہوتی ہے۔ انسان کے پاس کامیابی کا یہی راستہ ہے۔ جس کے تصور سے بھی دل مطمئن اور آسودہ ہوتا ہے۔

بہار نے بھی اطمینان قلب اور آسودہ ذہن کے لیے کئی گھنٹے رو رو کر اللہ سے فریاد کی تمثال کے دل کے پگھلنے کی آرزو کی، خود ہی کچھ قلبی سکون سا آ گیا تو اٹھی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ ابھی نماز فجر کے آثار ذرا سے فاصلے پر تھے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی، وہاں سے کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے سیدھی لان کے سامنے والے حصے کی طرف آئی مگر حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہاں خمار پہلے سے موجود کسی گہری سوچ میں ڈوبی ٹہل رہی تھی۔ فضا میں پھولوں کی ملی جلی مہک تھی مگر وہ کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔

"کیا طبیعت ٹھیک ہے؟" بہار نے ایک دم کہا تو وہ ڈر کے چونکی۔

"ہاں..... تم تم یہاں؟" وہ بری طرح ہکلائی۔

"میں تو فضا میں فریش ہونے کے لیے آئی تھی۔"

"مجھے بھی کچھ گھبراہٹ سی تھی۔" خمار نے کہا۔

"کیوں؟ سب کچھ تو میرا بگڑا ہوا ہے۔" وہ طنزیہ بولی۔

"اللہ نہ کرے کیا بگڑا ہوا ہے تمہارا؟" خمار نے جلدی سے ڈانٹا۔

"بابا ناراض تمثال ناراض، یہاں تک تمثال کے ابا بھی ناراض۔ میری محبت مجھ سے ناراض۔" وہ طنزیہ بولی۔

"کوئی ناراض نہیں ہے نہ ہی کچھ بگڑا ہے سب ٹھیک ہوگا ان شاء اللہ۔" خمار نے اس کو گلے لگا کر پیار سے تسلی دی۔

"کیا ہوا ہے، پریشان ہیں یا افسردہ؟" بہار کو اس وقت اس کا لان میں ٹہلنا پریشان کر گیا۔



"ایسا کچھ نہیں ہے، چلو بے فکر ہو کر اندر جاؤ۔" خمار نے تسلی دی۔

"آپ نے محبت نہیں کھوئی، اس لیے نہیں سمجھ سکتیں کہ میں بے فکر کیسے ہو جاؤں؟" بہار نے کہا۔

"مجھے محبت کا طعنہ کیوں دیتی ہو؟"

"بس جاننا چاہتی ہوں کہ محبت کی دوری نے جس طرح مجھے بے قرار رکھا ہے کاش آپ کسی سے محبت کرتیں تو سمجھ سکتیں۔" بہار نے کہا۔

"میں محبت کروں یا نہیں، اتنا تو احساس ہے ناں مجھے کہ میری بہن خوش رہے۔"

"ہنہ..... مجھے لگتا ہے کہ تمثال دور جا چکا ہے۔" وہ لمبی سانس بھر کے رہ گئی۔

"یقین رکھو وہ صرف تمہارا ہے، دور نہیں جائے گا۔"

"غور سے دیکھو اس محل کے در و دیوار کو تو ایسا لگتا ہے کہ یہاں کبھی محبت نہیں اتری، اس کے مکینوں کے دل محبت کے احساس سے عاری ہیں۔ میری مانیں تو اس کی محبت کی قدر کریں۔" بہار کہہ کر تیز قدموں سے واپس چلی گئی اور خمار کے اندر جیسے محبت کی یادوں سے الفاظ لپٹ لپٹ کر پکارنے لگے۔

"تیری یادوں کو بھی رسوا نہیں ہونے دیں گے، کچھ تو ہم خود بھی نہیں چاہتے شہرت اپنی اور کچھ محبت نے بھی ایسا ہونے نہیں دیا۔ نفرت ہو نہ سکی، بس محبت کرنا مشکل ہو گیا۔" وہ فجر کی اذان سن کر نماز پڑھنے کی نیت سے سب خیالات جھٹک کے اندر چلی آئی تھی۔

☆.....☆.....☆
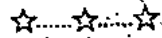
معمول کے مطابق ظہیر ہمایوں ناشتہ کر کے آفس کے لیے نکل گئے بنا کوئی بات کیے۔ خمار نے بھی کچھ نہیں کہا۔ تاج دین بابا نے مارکیٹ سے کچھ سامان لینا تھا وہ ان کے ساتھ آئے تھے۔ پہلے گاڑی ظہیر ہمایوں کے آفس پہنچی، ظہیر ہمایوں کو ڈراپ کر کے تاج دین بابا مارکیٹ چلے آئے تھے۔

ظہیر ہمایوں صاحب بڑی سنجیدگی سے سارے اسٹاف کے سلام وصول کرتے اپنے آفس میں پہنچے۔ بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ انٹرکام پر پیغام آ گیا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے بے دھیانی میں بھیج دینے کا کہہ دیا۔ نام نہیں پوچھا، نام نہ پوچھنے کا افسوس انہیں اس وقت ہوا جب نشید کمال شان تفاخر سے ان کے روبرو کھڑا ہوا۔ ان کی پیشانی پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ وہ مسکرایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دیکھو..... صبح صبح میرے کام میں بدمزگی نہ ڈالنا۔" انہوں نے کہا۔

"اگر آپ میری بات تسلی سے سن لیں گے اور کوئی بدمزگی نہیں کریں گے تو۔" اس نے اسی طرح خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بولو، جلدی اور مختصر۔"

"مختصر ہے تو فقط اتنی کہ خمار میری محبت ہے۔" اس نے کہا۔

"اس بکواس کے علاوہ۔"

"یہ بکواس کہہ کر آپ محبت کی توہین نہیں کر سکتے۔" وہ بولا۔

"بند کرو، یہ محبت محبت کا راگ۔" انہوں نے دبے دبے لہجے میں جھڑکا۔

"محبت کا راگ، اگر محبت راگ ہے تو اس کی حقیقت کو تسلیم کر لیجیے۔"

"نوجوان..... میری بہت اہم بزنس میٹنگ ہیں، میرا وقت خراب نہیں کرو۔" ظہیر ہمایوں خاصے ضبط کے ساتھ بولے۔

"آپ بھی میرا وقت خراب نہ کریں، جان لیں کہ میں شدید محبت کرتا ہوں خمار سے اور کسی صورت دستبردار نہیں

ہوسکتا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔
"مجھے مجبور نہ کرو کہ میں سیکیورٹی گارڈ کو بلاؤں"
"تو اس میں آپ کو نقصان ہوگا، جو پردے میں بات رہ گئی تو بھرم رہے گا۔ ورنہ بہت چرچا ہوگا۔" نشید نے کافی اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔
"کیا مطلب ہے اس دھمکی کا؟" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔
"مشورہ ہے دھمکی نہیں، میں آپ کی طرح معزز اور شریف انسان ہوں کیا ہم سکون و آرام سے بات نہیں کرسکتے؟" نشید کمال نے کافی نرمی سے پوچھا۔
"دیکھو...... ایک بار سمجھا دیا کہ میری بیٹی کا نام زبان پر نہ لاؤ، یہ محبت وحبت، عشق و عاشقی کوٹ میں مانتا ہوں اور نہ میری بیٹی کو اس سے مطلب ہے۔" وہ بولے۔
"بیٹی کی بات نہ کریں، صرف پہلے اپنی بات کریں تو آپ اور محبت کو نہیں مانتے، اس بات کو میں نہیں مانتا۔" وہ کہہ کر رکا اور پھر گویا ہوا۔
"آپ نے کبھی محبت نہیں کی؟"
"شٹ اپ...... اپنی اور میری عمر کا لحاظ رکھو اور ہم کیوں گفتگو کررہے ہیں، جاؤ یہاں سے۔" ظہیر ہمایوں خاصے غصے سے بولے۔
"تو ٹھیک ہے آپ میرے حق میں فیصلہ کردیں۔"
"وجہ...... میری بیٹی تمہارا ذکر سننا پسند نہیں کرتی۔" وہ طنزیہ ہنس کر بولے۔
"آپ تو پسند کرتے ہیں۔"
"پلیز... یہاں سے جاؤ۔"
"آج میں جانے کے لیے نہیں آیا بلکہ کچھ بتانے کے لیے آیا ہوں۔"
"کتنے پاگل ہو تمہاری ماں کو سمجھا کر بھیجا تھا پھر بھی آگئے۔"
"ہاں... آپ کو بھی تو کچھ سمجھانا ہے، میری ماما اور چاچو کی جس طرح آپ نے عزت افزائی کی، اس سے حیرت ہوئی کہ آپ بظاہر مہذب، شائستہ با اخلاق نظر آتے ہیں اندر سے کچھ اور ہیں۔ خیر یہ آپ کا اندر کا انسان خاصا غیر مہذب، ڈرپوک اور کمزور ہے جو سچائی اور حقیقت سے دور بھاگتا ہے۔"
"مسٹر! بہت ہوگیا۔"
"ہنہ...... شاید آپ کو خمار کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا ہی ہوگا آج کا دن اور رات آپ کے پاس ہے۔ کل آپ کی بیٹی کو نہیں بلکہ بیٹیوں کو اور سارے حلقوں کو آپ کی اصلیت اور محبت، دشمنی کی وجہ بیان کردوں گا۔ ذہن پر زور ڈالیے گا کہ کسی سے تو محبت ہوگی، محبت کے نام پر فریب دیا ہوگا۔ گڈ بائے سمجھ میں آجائے تو فون کردیجیے گا۔ ہم پردۂ راز میں سب معاملات طے کرلیں گے۔" وہ ایک منٹ انہیں دیکھ کر رکا اور کہہ کر ایک شان سے آفس سے باہر نکل گیا۔ ظہیر ہمایوں صاحب کی ریوالونگ چیئر نہ گھمانے پر بھی گھومی۔ اس کی باتوں کا ایسا الجھاوا تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھے اور کچھ سمجھنے کے درمیان پھنس گئے تھے۔

☆......☆......☆

نشید کمال تو جاچکا تھا اور جو کچھ کہہ کر گیا تھا اس نے ظہیر ہمایوں صاحب کو شدید طیش میں مبتلا کردیا تھا۔ انہوں نے سارا غصہ اپنی ریسپشنسٹ اور پی اے مسز اکبر پر نکالا کہ یہ شخص اندر کیسے آیا؟ کیوں پہلے نام نہیں پوچھا گیا۔ اتنا شدید ردعمل آفس میں کسی نے بھی آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے بہت حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پریشان ہوئے مگر جوں ہی کچھ دیر بعد خمار آفس آئی تو سب کی لٹکی ہوئی صورتیں دیکھ کر اپنی پی اے عنبرین سے استفسار کیا، اس نے ظہیر ہمایوں صاحب کے غصے کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کوئی صاحب آئے تھے ان کے جانے کے بعد صاحب بہت ناراض ہوئے۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی اپنے آفس میں داخل ہوئی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون ہوگا؟ اسی اثنا میں فون کی اسکرین پر ایک نمبر جگمگانے لگا تھا۔
"ہیلو......"
"کیسی ہو جان نشید؟" نشید کمال کی شوخ آواز ابھری۔
"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ غصے میں بولی۔
"خمار ہمایوں! آپ کے والد گرامی سے مل کر آیا ہوں، امید ہے وہ آپ کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ میری محبت سچی ہے۔" اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کردیا۔ وہ حیران و پریشان سی فون تکتی رہ گئی۔ توہین کے احساس نے اتنا اشتعال دلایا کہ اسی نمبر پر فون ملایا۔
"زہے نصیب۔" وہ فون ریسیو کرکے اترایا۔
"آپ کی اتنی جرأت کہ میرے بابا کے آفس آؤ اور بدتمیزی کرو۔" وہ بولی۔
"دیکھو... اس کا جواب لمبا ہے، کیوں نہ ہم گفتگو کرلیں۔" نشید نے کہا۔
"فرمائیں۔"
"آں ہاں...... فون پر نہیں کہیں باہر مل بیٹھتے ہیں آرام سے بات ہوجائے گی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔
"ہرگز نہیں۔ میں آپ کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"
"دیکھنی تو پڑے گی آج نہیں تو کل۔"
"آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ میرے بابا سے اب کبھی نہیں ملنا، وہ بہت ہائپر ہوئے ہیں۔" اس نے بتایا۔
"بات ہی ایسی ہے، خیر اگر آج مجھ سے مل لو تو ان کے لیے بہتر ہوگا۔"
"دھمکی؟"
"تو...... الس لو۔"
"کیوں ملوں؟"
"مل کر دیکھو۔"
"شرط ہے کہ آئندہ میرے بابا کو تنگ نہیں کرو گے۔"
"آپ کے بابا خود مجھ سے ملنے کی خواہش کریں گے۔" وہ بولا۔
"ایسا کیا ہے؟"
"شام پانچ بجے، لوکیشن سینڈ کردوں گا۔ اوکے بائے۔" وہ کہہ کر فون بند کرگیا۔
"ہنہ...... چیٹر، بابا کو جانے کیوں چیٹ کررہا ہے؟" وہ غصے سے بڑبڑائی اور دھم سے اپنی چیئر پر بیٹھ گئی۔ ذہن آؤٹ آف کنٹرول تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس سے ملنے کی ہامی بھرلی تھی۔

☆......☆......☆

جب انسان اپنے مقصد میں سو فیصد کامیابی کے لیے کسی کٹھن اور مشکل مرحلے سے گزر جائے تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا، قدم زمین پر نہیں فضا میں محسوس ہوتے ہیں، لبوں پر شوخ سی دھن ناچنے لگتی ہے۔ ارد گرد کی سب بدصورتیاں خوبصورتی میں بدل جاتی ہیں۔ نشید کمال کی یہی کیفیت تھی، وہ جھومتا جھامتا آفس کی بجائے گھر آ گیا تھا۔ بیگم ذکیہ کمال کی گاڑی نکل رہی تھی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر چلی گئیں لیکن حریم جو کہ ملازمین سے اچھی طرح صفائی کرانے میں مصروف تھی، ٹھٹکی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ تو وہ کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آئی۔ وہ پرسکون انداز میں آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ حریم نے بڑی شوخی سے پکارا۔

"آئے ہائے... راجا اندر صاحب بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"بات ہی ایسی ہے۔"

"کیسی؟"

"آخرکار زنار مجھ سے آج شام ملنے پر راضی ہو گئی۔" اس نے بڑی خوشی سے بتایا۔

"اچھا...! یہ تو اچھی بات ہے۔" حریم نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

"میں کہتا تھا ناں کہ ایک روز اس سے ملاقات میری مرضی اور میری پسند کے مطابق ہو گی۔"

"مبارک ہو۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ کہاں ملا جائے؟"

"ہاہاہا... بڑی بات کی، پورے لاہور میں کوئی جگہ ایسی نہیں کہ بیٹھا جا سکے۔" حریم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"دراصل... اسے لوگ پہچان لیتے ہیں، پرسکون اور اچھا ماحول ہونا چاہیے۔"

"ارے بابا کسی ریسٹورنٹ میں بلا لو۔"

"کیا رنگ خرید لوں؟" اس نے پوچھا۔

"اس کی انگلی میں پہلے سے موجود انگوٹھی ہے۔" حریم نے یاد دہانی کرائی۔

"ہنہ... وہ تو خود بخود اتر جائے گی۔" وہ وثوق سے بولا۔

"اتنا آسان نہیں، ماں باپ کو کیا بتائے گی؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میری محبت کے اقرار میں وہ خود انگوٹھی اتار پھینکے گی۔" اسے راسخ یقین تھا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔"

"میں مارکیٹ جا رہا ہوں رنگ خریدنے تم ساتھ چلو۔"

"میں کیوں؟"

"ذرا مشورہ ہو جاتا ہے۔"

"نہیں محبوب کی نظر سے دیکھ کر خریدنا، بہت اچھی خریدو گے۔" حریم نے پھول گرفتگی کے ساتھ کہا۔

"ہاں... بات تو صحیح ہے۔" وہ تائید کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ذرا کام دیکھ لوں۔"

"ہاں... آج کوئی خاص بات ہے۔"

"مہمان آ رہے ہیں۔" حریم نے مختصر سا جواب دیا۔

"کون مہمان؟"



"اسلام آباد سے۔" وہ کہہ کر جانے لگی تو اس نے چھیڑا۔

"اوہ... اچھا پاپا آ رہے ہیں۔"

"بس... بس۔" حریم باہر چلی گئی۔ نشید نے تیاری کی اسے تو مارکیٹ جانا تھا۔ زنار کے لیے رنگ خریدنی تھی۔

☆......☆......☆

فیشن شو میں شرکت کے لیے آج چاہت کی شام کی فلائٹ تھی۔ چاہت نے ایک ہفتے کے لیے یاسمین کو اس کے گاؤں بھیج دیا تھا۔ جگنو گھر پر رہے گا۔ وہ تیاری مکمل کر کے جب جانے لگی تو جگنو بہت اداس تھا۔ چاہت نے محسوس کیا۔ اس کو مسکرا کر دیکھا اور بولی۔

"کیا ہوا؟"

"ہمیں کیا ہونا ہے جی، ہم تو نوکر ہیں آپ کے۔" معصوم چہرہ بنا کر انتہائی سادگی سے جگنو نے جواب دیا تو چاہت کو ہنسی آ گئی۔

"ایسے منہ لٹکا کر یہ سب کہنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے کہا۔

"بس جی منہ ہی ایسا ہے۔"

"منہ تو بہت اچھا ہے، بلکہ بہت ہینڈسم ہو۔"

"ہیں...! سچ میم صاحب؟" جگنو نے دانتوں کی نمائش کی۔

"بالکل سچ۔"

"اب ہم آپ کے پیچھے اداس نہیں رہیں گے۔ یہی سوچ سوچ کر خوش رہیں گے۔" جگنو نے کہا۔

"اچھی بات ہے، اپنا اور گھر کا خیال رکھنا بلکہ بوتیک اور کارخانے کا بھی دھیان رکھنا ہے۔" چاہت نے کہا۔

"فکر ہی نہ کریں۔"

"یہ پیسے رکھو کوئی بھی ضرورت ہو تو استعمال کر لینا۔"

"نہیں پیسوں کی ضرورت نہیں، ہمارے پاس سب کچھ ہے۔"

"رکھ لو، ضرورت پڑ سکتی ہے۔" چاہت نے اصرار کر کے اس کو پیسے تھمائے۔

"شکریہ جی۔"

"اچھا بولو، کیا لے کر آؤں؟" چاہت نے پوچھا۔

"بس آپ جلدی سے آ جانا جی۔"

"بے وقوف کوئی چیز بتاؤ۔"

"کوئی چیز نہیں، بس آپ کا انتظار کریں گے۔"

"اچھا... ٹھیک ہے اب چلیں باہر صفدر صاحب اور مس بشریٰ آنے والی ہیں، میرا بیگ ان کی گاڑی میں رکھواؤ۔"

"جی ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر اس کا سفری بیگ اٹھا کر آگے آگے چلنے لگا۔ وہ پشت سے اس کے لمبے قد اور وجاہت کو سراہتے ہوئے چل رہی تھی۔ اس طرح تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا کہ کافی وجیہہ اور اسمارٹ نوجوان ہے۔ شکل وصورت کے ساتھ ساتھ بانکا اور سجیلا بھی تھا۔ اس کی ملازمت وہ بھی گھر کے نوکر کے طور پر کیوں تھا؟ یہ سوال گاڑی تک پہنچتے اس کے ذہن میں آیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ بہت محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجب سا فسوں تھا اس کی آنکھوں میں۔ بڑی اداسی سی تھی اس کے چہرے پر جیسے اس کے جانے سے اداس ہو۔

چاہت نے ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہا تو اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی مگر چاہت کا دل جیسے گیٹ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ اسے خود بہت غم تھا جگنو کو تنہا چھوڑ آنے کا یا پھر کچھ اور وہ کچھ دیر تک سمجھ نہیں پائی۔ ایئرپورٹ پہنچ کر حواس بحال کیے۔ جگنو کے خیال کو ذہن سے جھٹک دی تھا۔

☆......☆......☆

نشید کی خوشی دیدنی تھی۔ امجد کے ڈائمنڈ گولڈ آؤٹ لیٹ سے اس نے خوب صورت بہت قیمتی انگوٹھی پیک کرائی اور امجد کے چیمبر میں اس کے ساتھ ہی داخل ہوا۔

"ایسے نانا ناانگوٹھی کی خریداری ...... واہ کیا بات ہے؟" امجد نے ٹکڑا لگایا۔

"ہنہ...... بس ایسے ہی تیرے یار کی قسمت نے یاوری کی ہے۔" نشید نے حد مسرت کا اظہار کیا۔

"مطلب...... بھابی مان گئیں؟" امجد نے گیس کیا۔

"تقریباً۔"

"کیا مطلب؟"

"آج کچھ دیر بعد ہم دونوں مل رہے ہیں۔"

"گڈ...... مگر کیسے؟"

"بات چیت کے لیے رشتہ استوار کرنے کے لیے۔"

"مگر وہ منگنی اور ناپسندیدگی؟"

"وہ انگوٹھی اتار کر یہ انگوٹھی پہنائی جائے گی۔" وہ بولا۔

"کمال ہے...... کیا وہ اس سب کے لیے تیار ہیں؟" امجد کو حیرت تھی۔

"نہیں مگر ہونا پڑے گا۔"

"ایسا کیا ہے؟"

"تیرا یار زر گر ہے، جادوگر ہے سب ہوگا اس کا باپ بھی مانے گا۔" نشید کمال نے اترا ہٹ کے ساتھ کہا۔

"کون سا راز پا لیا؟" امجد نے کریدا۔

"تمہارا کو باپ سے بہت پیار ہے، میری آج کی ملاقات پر ظہیر ہمایوں صاحب تیخ پا ہوئے، شاید اسے پتا چلا تو مجھے فون کر کے ایسا نہ کرنے کو کہا۔ تب میں نے ملاقات کی شرط رکھ دی۔"

"اور وہ مان گئی۔ مطلب تو آج اس کے باپ سے ملا تھا؟"

"ہاں ناں...... بیٹی کا ہاتھ باپ سے ہی مانگنا تھا۔"

"اور پھر......؟"

"اور پھر آج ملاقات کے بعد پتا چلے گا۔"

"یعنی اپنے باپ کے لیے باپ کی ہی رضامندی سے یہی انگوٹھی وہ اتارے گی۔" امجد کے دل کو بات لگ نہیں رہی تھی۔

"اتارنی پڑے گی، ورنہ میں روز اس کے باپ سے رشتہ مانگتا رہوں گا۔"

"یار...... یہ بلیک میلنگ ہے۔"

"مجبوری ہے، باپ کی خاطر محبت قبول کرنی ہوگی۔"

"ایسے زبردستی کہتے ہیں۔"



"یار...... محبت دھیرے دھیرے بھی ہوتی ہے، میں تمہارا کو خود سے محبت کرنے پر مجبور کردوں گا۔ میری محبت اسے میری طرف راغب کردے گی۔" نشید کمال نے اتنے وثوق سے کہا کہ امجد چپ ہوگیا۔

"امجد...... تمہارے دراصل مجھے کوئی دل پھینک نوجوان سمجھ رکھا ہے۔" نشید دوبارہ گویا ہوا۔

"اس کا باپ بڑا مسئلہ کھڑا کرے گا۔"

"دیکھتے جاؤ۔" نشید بولا۔

"چلو ٹھیک ہے...... وش یو گڈ لک۔" امجد نے دعا دی۔ نشید نے اٹھ کر اللہ حافظ کہا اور امجد کے چیمبر سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

بہار بوجھل طبیعت کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ تاج دین بابا کسی کام سے وہاں آئے تو کچھ سوچ کر رک گئے۔ اس کے پاس آئے تو وہ چونکی۔

"کیا پریشانی ہے؟"

"تاج بابا...... دل چاہتا ہے یہاں سے دور بھاگ جاؤں یا پھر زہر کھالوں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"ہاں...... ٹھیک ہے اگر ہر طرح سے انسان ناکام ہوجائے تو پھر اسے مسلمان ہونے سے ہی بھاگ جانا چاہیے۔" تاج دین نے کہا اور جیب سے اپنا موبائل فون نکالا۔

"کیا مطلب؟"

"کیا نمبر ہے اس نوجوان کا؟" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

"کس...... کس کا؟" وہ ہکلائی۔

"وہ جو آپ سے ناراض ہے، جو کافی عرصے سے آیا نہیں۔" تاج دین بابا نے بڑی سادگی سے کہا۔

"آپ تمثا...... تمثال کی بات کررہے ہیں؟" وہ ایک دم کھڑی ہوئی۔

"ہاں...... یہ لو میرے فون سے اس کا نمبر ملا دو، دل کی گرہ کھولو۔ وہ مان جائے گا۔" انہوں نے گویا ساری حقیقت جان لی تھی۔

"اور بابا...... ؟"

"بابا...... وقت کے ساتھ ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"نہیں...... وہ تمثال کو پسند نہیں کرتے اور شہزل کے جانے کا الزام مجھے دیتے ہیں۔" وہ نم آلود لہجے میں بولی۔

"تم بات کرو۔"

"تاج بابا...... تمثال بہت خفا ہے، اس کے والدین آئے تھے یہاں آپ بتائیں۔" اس نے ایک دم ہی ان سے سوال پوچھ لیا۔

"کہا تو ہے تم بات کرو، جاؤ شاباش بات کرو۔" تاج دین بابا یکسر ٹال گئے۔

"سچ میں آپ گریٹ ہیں۔" وہ بہت زیادہ خوش ہوگئی۔

"اسے کہنا کہ شہزل جاچکا ہے۔" تاج دین بابا نے ہنس کر کہا۔

"میں کمرے میں جا کر بات کرتی ہوں۔"

"ہاں...... ہاں اگر نہ کرے تو ہم اس کے پاس چلے جائیں گے۔ ہماری بیٹی کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ آئے۔" تاج دین بابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر محبت بھری تسلی دی تو وہ واپس اڑتی ہوئی اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اس کے لیے یہ ٹیوشن ایک خوش کن احساس تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تمثال سے بات ہونے کا ایسا موقع بھی پیدا ہو سکتا ہے، کیسے اللہ تعالیٰ کو اس کی بے قراری، بے چینی دیکھ کر اس پر پیار آ گیا تھا۔ اس نے موقع فراہم کر دیا تھا۔ ورنہ اس کے ذہن کی بھٹی میں تو مایوسی کا مادہ پک رہا تھا جو کہ اسے لحہ لحہ متنفر اور مایوس کر رہا تھا کہ اچانک اللہ تعالیٰ نے سبب پیدا کر دیا۔ بالکل ایسے کہ جیسے اللہ سے براہ راست کلام ہو کر راستہ صاف ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

تمثال کو کئی روز سے فلو کی شدت نے گھیر رکھا تھا۔ کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی اور ایسے میں بخار کا ہونا یقینی عمل تھا۔ بستر بھی نہیں جا رہا تھا، اس وقت بھی اماں نے اس کے لیے دیسی چوزے کی یخنی بنائی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ غنودگی میں تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون بج رہا تھا۔

"تمثال... تمثال۔" اماں نے پکارا تو وہ کسمسایا۔

"بیٹا... فون بج رہا ہے۔" اماں نے کہا۔

"کس کا ہے دکھائیں؟" اس نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا اور انجان نمبر دیکھ کر فون بند کر کے رکھ دیا لیکن پھر اسی نمبر سے کال آنے لگی۔ اس نے پھر نمبر کاٹ دیا لیکن تیسری بار پھر اسی نمبر سے فون آیا تو اماں نے فون لے کر خود اٹینڈ کر لیا۔

"ہاں..... ہیلو تمثال پلیز فون بند نہ کرنا۔" دوسری طرف بہار تھی۔ اماں جان نے قطعاً نظر انداز کر دیا۔

"کون..... یہ غلط نمبر ہے۔" انہوں نے سنجیدہ سی آواز میں کہا اور فون بند کر دیا۔

"تمثال..... اٹھو میرا بچہ یخنی پیو۔" وہ تمثال سے مخاطب ہوئیں۔ تمثال نے ہمت کی اور تکیے کے سہارے ٹیک لگائی۔

"با....." نے استفسار کیا۔

"ہر ... وہ تو فروٹ لینے گئے تھے باہر کے ہی ہو کر رہ گئے۔"

"آ جائیں گے۔" وہ بولا۔

"میں نے منع کیا تھا کہ اس لڑکی سے بات نہ کیا کرو۔" انہوں نے چمچ بھر کے یخنی اسے پلائی۔

"کس... کون؟"

"وہی امیر لڑکی، جہاں سے ہمیں دھکے ملے۔"

"آپ دونوں پر سب کچھ وار سکتا ہوں۔"

"والدین بچوں کو دھوپ سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہاں اس محل میں تمہارے لیے دھوپ ہی دھوپ ہے۔" نور جہاں بیگم نے محبت سے اس کی پیشانی چومی۔ تمثال چپ رہا۔ صرف ان کا ہاتھ لبوں سے لگا لیا۔
محبت کے بھی عجب رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ رشتوں میں الگ الگ ڈھل کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ محبت صرف دو جنس میں ہی نظر نہیں آتی۔ محبت تو ہر رشتے سے ہونی چاہیے۔ تمثال کی زندگی میں محبت کی ایک صورت بہار ہے تو دوسری صورت اماں ابا۔ جو محبت کے ساتھ جنون عشق کی صورت ہیں۔

"تو کہو تو میں بابا کے لیے جاؤں۔"

"نہیں اماں..... کہیں بھی نہیں جانا۔" اس نے انکار کر دیا اور یخنی پینے سے بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"یہ ساری پینا ہے حالت دیکھی اپنی۔" وہ کہہ کر اٹھیں اور کمرے سے چلی گئیں۔ بادل نخواستہ اسے یخنی کے مگ کو ہونٹوں سے لگانا پڑا۔ اسی وقت فون بجنے لگا۔ اس نے اٹینڈ کر کے کہا۔

"ہیلو..." نقاہت میں ڈوبی آواز تھی مگر بہار نے پہچان لیا۔

"تمثال... تمثال پلیز فون بند نہ کرنا تمثال تمہیں اللہ کا واسطہ۔" بہار کی روتی تڑپتی آواز سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا مگر وہ بولا کچھ نہیں چپ رہا۔

"تمثال... تم پلیز یہ بتاؤ ٹھیک تو ہو؟"

"آپ کو کس بہار دانیوں فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

"تمثال... آپ نہیں تم۔ پلیز میری بات ایک بار سن لو۔"

"کیا سننے کو کچھ بچا ہے؟"

"پلیز..... تمثال میری کوئی غلطی نہیں۔"

"جہاں باپ چاہتا ہے وہیں رہو۔"

"کچھ نہیں ہے، بابا نے ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"مجھے ذسٹرب نہ کرو۔" اس نے فون کاٹ دیا اور آف کر کے رکھ دیا۔

وہ دیوانہ وار فون چوم چوم کر رو رہی تھی، ہنس رہی تھی۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ تاج دین بابا کو فون واپس کرتے ہوئے وہ متشکر ہوئی مگر آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"آواز تو سن لی ناں آواز تو سنا دی ناں۔" تاج دین بابا نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بابا..... اس نے فون بند کر دیا۔" وہ رو دی۔

"کوئی بات نہیں۔ کر دینے دو۔"

"تاج بابا..... وہ بہت ناراض ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا غصہ شاید زیادہ ہے۔"

"مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"معلوم ہے مجھے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"یہی کہ آپ کو کچھ معلوم نہیں۔" تاج دین بابا ہکلائے۔

"تاج بابا..... تمثال اچھا ہے ناں؟"

"ہنہ بہت اچھا ہے مگر....."

"مگر کیا؟"

"مگر میاں صاحب کی اپنی پسند ہوتی ہے۔"

"کاش بابا کو بھی کوئی پسند ہوتا۔"

"ہاں..... یہ تو ہے۔" وہ چپ سے ہو گئے۔

"تاج بابا..... آپ بابا سے کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہیں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کرو۔"

"بابا بات نہیں کر رہے، میں گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ تمثال سے ملنا ہے۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔

"صبر..... صبر میرا بچہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں میاں صاحب کا ذہن بدلنے کی کوشش کروں گا۔ وہ لڑکا اگر آپ

کے نصیب میں لکھا ہے تو وہ ضرور آپ کو ہی ملے گا۔" تاج دین بابا نے کہا۔

"آپ انہیں سمجھائیں کہ میں نے شمزل کو انکار نہیں کیا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے میں وہ کر رہی تھی مگر اب تمثال کو قبول کرلیں۔" اس نے کہا۔

"بٹیا... میاں صاحب دل کے بہت اچھے ہیں، محبت کرتے ہیں آپ دونوں سے بس اس لیے محتاط رہ کر فیصلے کرتے ہیں۔" انہوں نے سمجھایا۔

"محبت کے دشمن بھی ہیں۔"

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حوصلہ رکھو۔"

"تمثال سے ملنا ہے۔"

"مجھے پتہ دینا میں جا کر سمجھاؤں گا۔"

"سچ......؟" وہ خوش ہوئی۔

"ہاں..... اب آپ خوش ہو کر میاں صاحب کو منانے کی کوشش کرو۔" وہ بولے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولی۔ تاج دین بابا اپنا فون لے کر اس کے پاس سے اٹھ گئے۔ کام مشکل تھا جس کا وعدہ کیا تھا مگر کرنا تھے۔

☆......☆......☆

وہ سوچ و بچار میں گم تھی۔

آج کوئی کام بھی نہیں کرسکی تھی۔ بابا کے آفس میں بھی نہیں گئی۔ انہوں نے انٹرکام پر ہی کچھ پوچھا جس کا اس نے مبہم سا جواب دیا تھا۔ دراصل وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے بلاوے پر ملنے جائے یا نہیں۔ نشید کی ضد اور مستقل مزاجی کا تقاضا یہ تھا کہ اسے یہاں آنے سے روکا جائے اور مجبوراً ایک بار اس سے مل لیا جائے مگر دوسری طرف اپنی سوچ تھی کہ کیوں اس سے ملا جائے جس کے لیے دل میں کچھ بھی نہیں۔ اسی کشمکش میں سارا وقت گزر رہا تھا۔ آفس سے اٹھنے کا وقت ہوا تو اس کا نوٹیفکیشن میسج آ گیا۔ وقت کہی تھا وہ بے بس ہی ہو کر بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کا ناخن کترنے لگی۔

"خمار ہمایوں...... ایک بار اس سے مل لو ورنہ وہ بار بار تنگ کرتا رہے گا۔" یہ سوچ کر اس نے خود کو تیار کیا۔ ہاتھوں سے بال سنوارے اور پرس اٹھا کر باہر آ گئی۔ ڈرائیور کو ایڈریس سمجھایا اور خود سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی رکی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ڈرائیور کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر خود ریستوران کے اس حصے میں آ گئی جس کے بارے میں میسج میں لکھا تھا۔ وہ بالکل ایک طرف سب کی نظروں سے اوجھل کونا تھا جو سرخ گلابوں سے سج گیا تھا۔ نشید کمال اپنے سینے سے لگائے بڑا سا گلابوں کا گلدستہ اس کی آمد پر جھک کر مسکرایا۔ اسے سب بہت عجیب سا لگا۔ قریب پہنچی تو اس نے گلدستہ اس کی طرف بڑھایا تو مجبوراً اسے لینا پڑا مگر کہنا پڑا جس میں دباؤ با غصہ شامل تھا۔

"اس تماشے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ سب میرا کھلا دل ہے، اس کا منظر ہے، میں اتنی محبت کرتا ہوں۔" وہ عالم جذب میں ڈوب کر بولا۔

"بند کریں یہ محبت نامہ آپ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔" وہ سختی سے بڑبڑائی۔

"بیٹھیے تو سہی۔" اس نے کہا تو وہ بیٹھ گئی، وہ بھی بالکل اس کے سامنے بیٹھ کر دوبارہ بولا۔

"دو باتیں ہیں، اگر نہیں سوچا تو اب سوچنے لگیں، دوسری بات انگوٹھی اتارنے پر پریشان ہیں تو یہ بندوبست میں نے



کر دیا ہے، انگوٹھی میں لایا ہوں کہیں تو پہنا دوں؟" اس نے جیب سے خوب صورت سی ڈبیا نکال کر کھولتے ہوئے دکھائی۔

"واٹ...... !" وہ چلائی۔

"انگوٹھی ہے، چلانے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ سے میری بے تکلفی نہیں ہے، جو بات کرنی ہے کریں۔" وہ بولی۔

"پہلے یہ ہاتھ میری طرف لائیں یہ انگوٹھی اتار کے۔" نشید نے سفید ہیرے کی بہت نازک کی اس انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا جو پہلے سے اس کی انگلی میں تھی اور جو بابا نے اس کی سالگرہ پر دی تھی۔ غالباً وہ اسے منگنی کی انگوٹھی سمجھ رہا تھا۔

"یہ فضول بحث بند کریں، اصل بات بتائیں۔"

"خمار پلیز میری محبت قبول کرلو۔" اس نے کافی سنجیدگی اختیار کی۔

"میرے بابا کے پاس آئندہ ہرگز نہیں جانا۔"

"اس موضوع پر اگر آپ میری انگوٹھی پہن کر کچھ کہو گی تو قبول ہے۔"

"مطلب بلیک میلنگ۔"

"میں نے اس انگوٹھی میں اپنا دل رکھا ہے۔"

"اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ محبت کے لیے زبردستی نہیں ہوتی۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔" اس نے کہا اور آرڈر دینے کے لیے اشارہ کیا۔

"پلیز...... مجھے جانا ہے اور یہ بھی کہنا ہے کہ میرے بابا کو تنگ نہیں کرنا آئندہ اور میرے انکار کو قبول کرلو۔" وہ کہہ کر بجلی کی مانند نکل گئی۔ نشید غم و غصے سے اسے جاتا دیکھتے رہ گیا۔

☆......☆......☆

پھول اور انگوٹھی اس کا منہ چڑا رہے تھے، کچھ دیر پہلے کی خوشی غارت ہوگئی تھی۔ گلاب سارے کے سارے کانٹے بن کر اس کی روح میں اتر رہے تھے۔ کنپٹیوں کا تناؤ سخت بڑھ چکا تھا۔ پورے بدن میں جیسے زہر سرایت کر گیا تھا۔ غم و غصے کے ساتھ انگوٹھی کی ڈبیا جیب میں رکھی اور پھول وہیں چھوڑ کر اٹھ آیا۔ منیجر اور ویٹرز دیکھتے رہ گئے۔ اس نے ریستوران سے نکل کر لمبے لمبے سانس لیے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

غصے کا یہ عالم تھا کہ گاڑی کے ٹائر بری طرح درد سے چلا رہے تھے۔ وہ گاڑی چلا نہیں رہا تھا۔ گاڑی غصے کی گرفت میں تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اسی کیفیت میں اس کی خود کلامی شروع کر دی تھی۔

"خمار ہمایوں...... تم نے پھر میری محبت کی توہین کی ہے، میرے جذبوں کو ٹھوکر ماری ہے۔ ایک بار تم کو حاصل کرلوں پھر محبت کرنا تو میں تمہیں ایسے سکھاؤں گا کہ عمر بھر میرے قدموں سے سر نہیں اٹھا سکو گی اور وہ تمہارا باپ، اسے تو میں دیکھ ہی لوں گا۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید حواس کھو بیٹھتا، امجد کا فون آ گیا۔ اس کی توجہ بٹ گئی۔

"میں تیرے پاس آ رہا ہوں کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"گھر۔"

"او کے۔" اس نے فون بند کیا اور امجد کی رہائش گاہ کی طرف گاڑی کا رخ موڑ دیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ امجد کے روبرو تھا۔ امجد اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ وہ ناخوش لوٹا ہے۔ اس نے سلیقے سے لان میں ہی اسے بٹھایا اور اورنج جوس منگوایا۔

"یار موڈ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"جوس کا موڈ نہیں ہوتا بس پی لیتے ہیں۔ بعد میں چائے پئیں گے۔" امجد نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔
"جو جاننا چاہتا ہے بول۔" نشید نے اس کی سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے پوچھا۔
"جو کہانی تیرے چہرے پر لکھی میں پڑھ چکا ہوں اس کے بارے میں کیا پوچھوں؟ اس کے سیاق وسباق سے واقف ہوں، تجھے سمجھایا بھی اسی لیے، منع بھی اسی لیے کیا اور یہ بھی بتایا کہ اللہ نے کچھ چیزوں میں، کچھ کاموں میں بھلائی رکھی ہوتی ہے۔ تجھے معلوم نہیں شاید، ظہیر ہمایوں کو معصوم چاہت کی محبت کی بددعا ہے۔ وہ اور اس کی بیٹیاں محبت سے دور رہیں گے۔ بے کار وقت اور پیسہ برباد کر رہا ہے تو۔" امجد کے اندر سے ایک طوفان نکلا اور اسے حیران کر گیا۔
"دل کا کیا کروں؟"
"جو وہ تیرے دل کا حال کرگئی ہے اس کے بعد بھی پوچھتا ہے۔ محبت کرنے والی حریم کی خاموش پرستش کی تو نے قدر نہ کی، اس کی بددعا بھی تجھے لگی ہے۔"
"حریم کو پہلے دن سے چاہا ہے کہ وہ میری کزن اور دوست ہے۔ منگیتر تو گھر والوں نے بنا رکھا تھا۔"
"چلو یونہی سہی، کاش تم قدر کرتے۔"
"امجد... تو تو سمجھ سکتا ہے کہ تمہارا میرا عشق ہے۔ میرا دل اس کے نام سے دھڑکتا ہے۔" وہ بولا۔
"اللہ کا نام لے کفر نہ بول، دل معبود حقیقی کے حکم سے دھڑکتا ہے اس کے علاوہ کس کو یہ مقام حاصل؟" امجد کے اندر سے اللہ کی محبت فوراً باہر آئی۔
"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"
"بہر کیف... ہوتا یہ ہے کہ جس چیز کے پیچھے انسان بھاگتا ہے وہ انسان سے دور بھاگتی ہے۔ تو چھوڑ دے پھر ہوسکتا ہے وہ آجائے۔ جب کہ بے اصولی بات تو کر رہا ہے اس کی منگنی ہوگئی ہے۔" امجد بولا۔
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"وہ جس طرح اس لڑکے کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوش ہے۔"
"چلو..... دیکھتے ہیں۔" نشید نے اورنج جوس کا خالی گلاس یہ کہتے ہوئے رکھا۔
"اللہ ہی رحم کرے تجھ پر۔" امجد نے صدق دل سے دعا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

ٹی وی لاؤنج قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ نشید نے قدم اس طرف بڑھائے۔ فردوسی آپا، شکیب، جمال چاچو اور ماما کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ اسے دیکھ کر سب مسکرائے، اس نے سلام کیا اور اسی محفل کا حصہ بن گیا۔
"بڑے وقت سے آئے ہو ساتھ چائے پینے کا مزہ آئے گا۔" جمال صاحب نے کہا۔
"آپ لوگ اچانک۔" وہ فردوسی آپا اور شکیب سے مخاطب ہوا۔
"ارے اچانک کہاں ہم نے پہلے سے بتا رکھا تھا۔" فردوسی آپا بولیں۔
"شاید حریم نے بتایا تھا۔" اس نے بوکھلاہٹ میں حریم کا سہارا لیا۔
"ہم نے شادی کی شاپنگ کرانی ہے حریم کو۔" شکیب نے خوشی سے بتایا۔
"او..... گڈ۔"
"ذکیہ... نشید کی کب شادی کرنی ہے؟" فردوسی آپا نے پوچھا۔



"جب نشید چاہے گا۔" ذکیہ کمال نے جواب دیا۔
"بہت جلد شاید حریم اور شکیب سے بھی پہلے۔" نشید نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔
"ماشاءاللہ... ان شاءاللہ۔" فردوسی آپا نے کہا۔
"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔" جمال صاحب نے کہا۔
"ذکیہ لڑکی پسند کرلی کیا؟" فردوسی آپا نے پوچھا۔
"جی... جی۔" جمال صاحب نے جلدی سے کہا۔
"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ بولیں۔
"نشید... دیکھو چائے میں کتنی دیر ہے؟" بیگم ذکیہ کمال نے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے کہا تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔
"اچھا ہوگا حریم جائے گی اور نشید کی دلہن آجائے گی۔" فردوسی آپا بولیں۔
"ان شاءاللہ۔"
"جاؤ بیٹا آپ بھی کچن میں دیکھو حریم کیا کر رہی ہے۔" فردوسی آپا نے شکیب کو بھی جانے کو کہا۔
"ہاں... ہاں جاؤ بیٹا۔" جمال صاحب نے کہا۔
"اوکے۔" شکیب نے کہا اور خود بھی نشید کے پیچھے اسی طرف چل دیا۔ تب فردوسی آپا نے پوچھا۔
"ذکیہ... نشید نے اپنی پسند سے لڑکی تلاش کی ہے یا...؟"
"ارے آپا ہم سب کی پسند ہے، بس اللہ اچھا کرے۔" جمال صاحب نے جلدی سے کہا۔ اتنی دیر میں ملازمہ چائے کے ساتھ لوازمات سے بھری ٹرالی لے آئی۔ ساتھ ہی حریم تھی، ہلکے جامنی لباس میں سر پر دوپٹہ جمائے جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ اس نے ٹرالی سے پلیٹیں اٹھائیں۔ سب سامان میز پر رکھوایا۔ فردوسی آپا کے حسن سلیقہ پر فریفتہ ہوتی رہیں، پشت پہ اس کے ریشمی بال لہرا رہے تھے۔ فردوسی آپا نے بلائیں لیں۔
"ماشاءاللہ سے ہماری حریم جیسی لڑکیاں اب کہاں؟ اسلام آباد میں تو یورپ کی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں، میرے شکیب کی پہلے دن سے خواہش تھی کہ شرمیلی، لمبے بالوں والی لڑکی سے شادی کرنی ہے، اللہ نے اس کی سن لی۔" فردوسی آپا کی بات کے دوران ہی نشید آچکا تھا۔ اس کے ساتھ شکیب بھی تھا جو حریم کو نگاہوں نگاہوں میں سراہ رہا تھا۔ نشید نے جملہ کسا۔
"مبارک ہو یار..... حریم قسم سے جنت کی حور ہے۔" حریم نے اس کا جملہ سن کر پہلی مرتبہ پلکیں اٹھائیں اور سنجیدہ نظروں سے نشید کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

حریم چائے سرو کرکے بجھی بجھی سی رات کے کھانے کی تیاری کے لیے باورچی خانے کی طرف جانے لگی تو شکیب ایک دم سامنے آگیا تو وہ ٹھٹکی۔
"پلیز شکیب..... میں مصروف ہوں۔" اس نے کہا۔
"کہاں مصروف ہو؟"
"رات کا کھانا میں خانساماں کی مدد کرنی ہے۔"
"اور ہم جو صرف آپ کے لیے آئے ہیں، ہمارا کیا ہوگا؟" وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر بولا۔
"آج تو آپ آئے ہیں۔"
"ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ شاپنگ کریں گے، یہ پروگرام سب کا ہے۔" اس نے بتایا۔

"نہیں ابی پرہیزی کھانا کھا۔۔۔ بس فورامیڈیسن کھاتے ہیں۔"
"مگر آج وہ بہت خوش ہیں، یہ پروگرام انہوں نے ہی ڈن کیا ہے۔" شکیب نے کہا۔
"پلیز شکیب، میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ کہہ کر کچن میں گھس گئی۔ وہ پیچھے آیا۔
"حریم ... ڈونٹ فیئر۔"
"کہا ناں کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، آپ جو چاہیں کریں۔" اس نے سبزی کی باسکٹ اٹھائی اور ضرورت کے مطابق منتخب کرنے لگی۔
"کیا مطلب؟ دلچسپی نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوکر بولا۔
"مطلب ... میں شاپنگ کی شوقین نہیں۔"
"ہماری شادی کی شاپنگ ہے۔"
"تو آپ کرلیں، بابا کی ای کرتی ہیں میری شاپنگ۔"
"نہیں ... آپ کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔" وہ اڑ گیا۔
"شکیب ... مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔" اس نے سختی سے کہا۔
"خانساماں ... آپ کچھ دیر کے لیے باہر جائیں۔" شکیب نے خانساماں کو وہاں سے بھیجا تو حریم اور زیادہ بیزار ہوگئی۔
"یہ کیا بچکانہ حرکت ہے۔"
"حریم ... آپ خوش بالکل نہیں ہیں آخر کیوں؟" شکیب نے کافی سنجیدگی سے پوچھا۔
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں خوش ہوں۔" اس نے ٹالا۔
"تو پھر ظاہر بھی کرو۔"
"کیا کروں؟"
"تیار ہوکر ہمارے ساتھ چلیں۔" وہ بولا۔
"کل شاپنگ کے لیے چلوں گی۔"
"نہیں ... آج ہم سب کے ساتھ۔" وہ اڑا رہا۔
"اچھا بابا ... آپ یہاں سے جائیں۔ میں تیار ہوکر آتی ہوں۔" حریم نے ہتھیار ڈال دیے۔
"اوکے ... بہت جلدی سے تیار ہوکر آئیں۔" وہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔
تو بادل نخواستہ حریم کو باورچی خانے سے باہر آنا پڑا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ناچاہتے ہوئے لباس کا انتخاب کرکے تیاری کرنی پڑی۔ ابی خوش تھی ان کو وہ دکھی کرنا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کچھ دیر آرام کی غرض سے بیڈ کا سہارا لیا تھا۔

☆......☆......☆

ظہیر ہمایوں صاحب اپنے کمرے میں بند تھے۔ نہ کسی سے بات کی تھی نہ کچھ کھایا پیا تھا۔ خمار نے کئی بار کمرے میں آکر بات کرنی چاہی مگر انہیں آنکھیں موندے دیکھ کر بنا کچھ کہے واپس چلی جاتی۔ ایسے میں صرف تاج دین بابا ہی تھے جو ان سے بات کرسکتے تھے۔ کچھ بول سکتے تھے۔ کچھ پوچھ سکتے تھے۔ یہی سوچ کر خمار نے تاج دین بابا کو ان کے کمرے میں بھیجا۔ تاج دین بابا نے ہمت کرکے جسارت کی۔
"کون سا غم ہے جو آپ کو چاٹ رہا ہے؟" ان کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔



"تاج دین...... غم سے زیادہ غصہ مجھے کھا رہا ہے۔" وہ بولے۔
"کتنے دن گزر گئے اب غصہ نکال باہر پھینکیں۔"
"کس کس غصے کو نکالوں ہر روز ہی ایک نئی اذیت کھڑی ہوجاتی ہے۔" وہ بولے۔
"کس قدر حالت خراب کررکھی ہے، بچیاں آپ کی وجہ سے پریشان ہیں، میں جانتا ہوں آپ کو کیا پریشانی ہے؟ یہ تنہائی چاٹ رہی ہے ساتھی ہوتو ..."
"ایک ہی بات کیا کرنی؟ جو وقت کی گردش میں رہ گیا، اس کا ذکر کیا کرنا؟" ظہیر ہمایوں صاحب نے تاسف کہا۔
"اخاہ...... میاں صاحب، وقت تو آپ نے خود دھکے مار کے نکالا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اس گھر میں خوشیاں ہوتیں۔"
"خمار، بہار کی خوشیاں بچاتے بچاتے شاید اپنی خوشی فراموش کرگیا۔"
"خمار بٹی، بہار بٹی کی خوشیوں کو کیا خطرہ ہے آپ کس خوف کا شکار ہیں؟"
"پتا نہیں تاج دین مجھے خمار اور بہار کے لائق کوئی جچتا نہیں۔ جو محبت کا کلمہ پڑھتے ہیں وہ بھی نہیں۔ جانے میں اتنا انتہا پسند کیوں ہوں؟ اپنی دونوں آنکھوں کو کہاں دیکھنا چاہتا ہوں، کسی پر اعتبار نہیں۔"
"یہ آپ کی عادت ہے اعتبار نہیں کرتے۔"
"کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"میاں صاحب...... کچھ نہیں، آپ خود کو دیکھیں کتنے اکیلے پڑ گئے ہیں، بچیاں الگ الگ خاموش ہوگئی ہیں۔ میاں صاحب، میں عام سا خدمت گار ہوں، بڑی بڑی کتابیں نہیں پڑھیں میں نے بس اتنا پتا ہے کہ محبت تو خود رب نے کی۔ لوگ اچھے برے، امیر غریب ہوتے ہیں، محبت سچی، صاف اور رب کے جیسی ہوتی ہے آپ جانے کیوں محبت سے ہی ڈرتے ہیں۔ میاں جی آپ نے اپنے ساتھ تو جو کیا ہی کیا پر بہار بٹی اور اس پیاری سی بٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا آپ نے۔"
"پیاری سی بٹی مطلب؟" انہوں نے ٹوکا۔
"آپ دل سے سوچیں گے تو مطلب سمجھ میں آجائے گا۔"
"ہاں تو جھوٹی تھی ناں اس کی محبت، مشروط محبت۔" وہ طنزیہ بولے۔
"کیا مشروط؟ میاں صاحب، اس بی بی کی شرط نہیں ضرورت تھی بلکہ ہر بی بی کو عزت دار گھرانہ چاہیے ہوتا ہے آپ کے پاس کیا کمی تھی؟ اس محل میں کیا تنگی تھی۔" تاج دین بابا بولتے رہے۔
"کمی اور تنگی کی وجہ نہیں؟ سوسائٹی میں وضع داری اور ساکھ قائم رکھنی ہوتی ہے، خود کو اس طرح ظاہر کرنے کا مطلب اپنی بیٹیوں کو بے عزت کرانا تھا۔" وہ اب بھی سوچ پر شرمندہ نہیں تھے، صرف افسردہ تھے۔
"مرضی ہے آپ کی مگر بہار بٹیا کے لیے سوچ بدلیں۔" تاج دین بابا کہہ کر اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ ظہیر ہمایوں صاحب انہیں بتا نہیں سکے کہ آج وہ خمار کی وجہ سے بھی بے حد ڈسٹرب ہیں۔

☆......☆......☆

بندہ تو گناہ گار ہے رحمٰن ہے مولا
بندے پر کرم کرنا تیری شان ہے مولا
بندہ تو گناہ گار ہے رحمٰن ہے مولا
رحمٰن ہے مولا

شمسو چاچا کی سریلی، مالک حقیقی کی محبت میں رچی بسی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔

وہ کام ختم کرچکے تھے۔ جگنو ان کے لیے چائے اور بسکٹ لایا تھا۔

"شمسو چاچا، گائیں ناں، اتنا اچھا لگ رہا تھا۔" جگنو نے فرمائش کی۔

"اوئے بھلے مانس، اذان ہونے والی اے۔" شمسو چاچا ہاتھ دھو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ جگنو بھی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"واہ..... بڑی چس والی چائے ہے۔" جگنو نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"شاوا بھئی..... سوادآ گیا۔" شمسو چاچا نے بھی چائے کی تعریف کی۔

"بی بی کی چائے بنانا کر سیکھی ہے۔"

"ویسے آج کچھ سونا سونا لگ رہا ہے۔" شمسو چاچا نے کہا۔

"ہاں..... بہت ویرانی ہے، مشکل سے دن گزرا ہے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

"تو سیر سپاٹا کرتا۔"

"او کدھر چاچا، گھر اور کارخانا کیلے تو نہیں چھوڑ سکتے تھے جگنو صاحب۔" وہ لہرا کر بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کاکا۔ چوری چکاری کا ڈر لگا رہتا ہے۔"

"ہنہ....."

"چل کچھ دیر تو تیرا وقت میں نے اچھا کردیا۔"

"تو ایسا کر رات میرے پاس رہ جا۔" جگنو نے پیار سے کہا۔

"رہ جاتا مگر بے زبان بیٹی بھوکی پیاسی راہ دیکھے گی۔"

"بے زبان بیٹی؟"

"ہاں..... میں نے ایک سوہنی سی بکری پال رکھی ہے۔ بھوکی پیاسی ہوگی۔"

"ہاہاہا..... بکری۔" جگنو زور سے ہنسا۔

"اوئے ہاں، بکری نکی سی لے کر پالی ہے۔ بڑی گوڑھی محبت ہے ہماری، بھوکی مرجائے گی پر گھر والی کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھائے گی۔"

"پھر تو تجھے جانا چاہیے اس معصوم کو راہ ند کھا۔ ہم تو اکیلے رہ لیں گے، بی بی صاحبہ کو فون کرلیں گے۔"

"تو بہت چنگا ہے کاکا۔ بی بی کا بہت خیال رکھتا ہے ورنہ وہ بچاری کلم کلی کیا کرتی؟"

"وہ تو جگنو صاحب مرتے دم تک خیال رکھیں گے۔" اس نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

"جیوندا رہ پتر۔" شمسو چاچا نے چائے کی آخری چسکی لی۔

"بس بی بی صاحبہ کی کمی بہت محسوس کررہے ہیں ہم۔" جگنو نے کہا۔

"یہ تو ہے۔" شمسو چاچا اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چل ہوئے۔"

"ہاں..... کل زندگی رہی تو ملاقات رہے گی۔" شمسو چاچا اپنا باغبانی میں استعمال ہونے والا سامان لے کر چلے گئے جگنو چائے کے کپ ٹرے میں رکھ اندر چلا آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سب لوگ تیار ہوکر بیگم زکیہ کمال کا انتظار کررہے تھے۔ نشید کو بھی اصرار کرکے راضی کرلیا گیا تھا۔ وہ تیار ہوکر آ گیا۔



بیگم زکیہ کمال کی طبیعت کچھ ناسازسی ہوئی تو انہوں نے معذرت کرلی۔ بس حریم کی تو جان پر بن آئی مگر زکیہ بیگم نے اسے تسلی دے کر جانے پر آمادہ کرلیا۔ وہ خاص تیاری کے ساتھ باہر آیا تھا۔ تبھی زکیہ بیگم نے ملازمہ کے ذریعے اسے کمرے میں بلایا۔ وہ فوراً ہی کمرے میں پہنچا مگر زکیہ بیگم کے ہاتھ میں انگوٹھی والی ڈبیہ دیکھ کر ٹھٹکا۔

"جی ماما۔"

"یہ شاید آپ کی ہے۔" وہ بولیں۔

"یہ آپ کے پاس۔"

"ہاں آپ کے کمرے کے باہر سے ملازم کو ملی ہے۔"

"جی..... گرگئی ہوگی۔"

"کس کے لیے لی تھی؟"

"آپ کو معلوم تو ہے۔"

"اب بھی اس لڑکی سے امید لگا رکھی ہے؟"

"ہاں..... آپ کی ساتھ جو کیا وہ بھول تو نہیں سکتا ناں۔"

"نشید..... اس لڑکی کو چھوڑ دو، وہ اب آپ کے قابل نہیں، کسی کی منگیتر ہے۔"

"آپ کی بہو وہی بنے گی۔"

"مجھے کوئی خواہش نہیں۔"

"اچھا۔ مجھے دے دیں کل مجھے اس کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا تو بیگم زکیہ کمال نے ڈبیا اسے تھمادی۔

"مگر یہ انگوٹھی کل آپ کے کام نہ آئی تو پھر جسے میں انگوٹھی پہناؤں گی۔ وہی آپ کی پسند ہوگی۔"

"منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔" بیگم زکیہ کمال نے اسے کہا اور جانے کی اجازت دے دی۔

"اوکے ٹیک کیئر۔" وہ ان کی پیشانی چوم کر بولا اور باہر نکلا تو باہر حریم موجود تھی۔

"کیوں بلایا تھا تائی امی نے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں، ویسے ہی کچھ کہہ رہی تھیں۔" وہ ٹال گیا۔

"وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"ہاں ناں۔" وہ چڑ سا گیا۔

"کھانے کو کیوں دوڑتے ہو؟" حریم برا مان کر پلٹ گئی۔

"حریم..... حریم یار بات سنو۔" وہ آوازیں دیتا اس کے پیچھے آیا۔ شکیب اس کی آواز پر سامنے آتے ہوئے بولا۔

"ناراض کردیا ناں میری حریم کو۔"

"ایکسکیوز می..... وہ آپ سے پہلے میری کزن اور....." نشید تن کر کہتا کہتا رک گیا۔

"کزن اور.....؟" شکیب نے اس کا جملہ اچک لیا۔

"دوست ہے، بہت اچھی دوست۔" نشید کو شکیب کا اس طرح پوچھنا کچھ عجیب سا لگا۔ حریم کو شکیب نے دیکھا اور پھر پراسراری مسکان کے ساتھ بہت خاموشی سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوگیا۔ جہاں سب ان کے منتظر تھے۔

☆.....☆.....☆

"بس الجھ گیا ہوں آپ دونوں کے لیے جیسا سوچتا ہوں اس میں الجھتا جاتا ہے۔" وہ لیپ ٹاپ آف کر کے آنکھوں کو سیدھے کی دو انگلیوں سے دباتے ہوئے بولے۔

"بس آپ ریلیکس رہیں، کہیں آپ کو کچھ نہ ہو جائے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"جیتی رہو...... جاؤ جا کر کل کی میٹنگ کا ایجنڈا دیکھ لو اور آرام کرو۔"

"کھانا تیار ہے۔"

"اوہ ہاں...... چلو میں آتا ہوں، بہار کو بھی بلواؤ۔" انہوں نے کہا تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"نہیں...... میری خمار معصوم ہے یہ اس میں انوالو نہیں، وہی ڈھیٹ ہے، آج اگر آیا تو گارڈ سے کہہ کر دھکے مار کر نکلواؤں گا۔ وہ ڈھیٹ ہے تو میں بھی انا پرست ہوں۔" وہ خمار کے جانے کے بعد بڑبڑائے۔

سچ بھی یہی تھا کہ انہوں نے انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا ورنہ نشید کسی لحاظ سے کمتر نہیں تھا۔ محبت کے نام پر ان سے اپنی بے عزتی کرا رہا تھا۔ یہ اس کی محبت کی سچائی تھی۔

☆......☆......☆

جگنو نے رات بھر جاگ کر چاہت کے فون کا انتظار کیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فون دیکھتا رہا مگر فون نہیں آیا۔ صبح سر میں شدید درد تھا۔ طبیعت بوجھل تھی مگر تہیہ کر کے اٹھا کہ یاسمین نہیں ہے تو کیا ہوا خوب اچھے سے صفائی کرنی ہے۔ ناشتہ کیا، سر درد کی گولیاں کھائیں اور کمر کس لی، باہر سے صفائی کا آغاز کیا۔ تقریباً گھنٹہ لگا جب اندر آیا تو تخت پر رکھا موبائل فون بج رہا تھا۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا اور اٹینڈ کیا۔

"السلام علیکم...... جگنو کہاں تھے؟" دوسری طرف سے چاہت کی آواز آئی تو وہ کھل اٹھا۔

"جی...... وہ باہر تھے صفائی کر رہے تھے آپ بتائیں آپ تو اچھی ہیں، سب اچھا ہے ناں، اپنا خیال رکھا ہے ناں؟" اس نے ایک ساتھ سب سوال کر ڈالے تو وہ ہنس دی۔

"ہاہاہا...... سب سوال کا ایک ہی جواب، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اللہ کا شکر ہے جی۔"

"تم بھی اپنا بہت خیال رکھنا۔"

"ہاں جی...... ہم خیال رکھ رہے ہیں۔"

"اور کوئی بات؟" چاہت نے پوچھا۔

"ہم نے ساری رات فون کا انتظار کیا تھا۔ آپ فون کر لیا کریں۔"

"ارے پاگل ہو، کیوں انتظار کیا؟"

"یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔" اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

"اچھا خیر...... بس کوئی اور بات۔"

"ایک بات ہے جی۔"

"بولو۔"

"آپ جلدی سے آ جائیں جی۔ ہم بہت اکیلے پڑ گئے ہیں۔" بڑی رونی سی آواز میں اس نے کہا تو چاہت کی تعجب بھری آواز آئی۔

"کیوں...... کیوں؟"



"پتا نہیں جی، بس آپ کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔"

"حیرت ہے۔"

"سچ ہے جی۔"

"اچھا چلو...... باتیں نہ بناؤ آرام کرو۔"

"آپ جلدی آ جائیں۔" اس نے معصومانہ فرمائش کی۔

"اچھا...... ابھی یہاں معروفیت ہے، کل تو ریہرسل ہے۔" وہ بولی۔

"وہ کیا ہوتی ہے؟"

"اب تمہیں کیا بتاؤں تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"ہاں جی...... ہم تو نہیں جانتے۔"

"اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

☆......☆......☆

فردوسی آپا نے اس کے ناں ناں کرتے بہت ساری شاپنگ کرا دی تھی۔

شکیب نے بھی کچھ اپنی پسند سے خریدا۔ نشید کمال اور جمال صاحب مال کے کیفے میں چائے انجوائے کرتے رہے۔ اس کے بعد سب ڈنر کے لیے پہنچے۔ ڈنر کے بعد گھر پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج گئے تھے۔ بیگم ذکیہ کمال جاگ رہی تھیں، انہوں نے مسکرا کر ان کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ سب سامان فردوسی آپا نے کھول کھول کر انہیں اسی وقت دکھانا شروع کر دیا تھا۔ حریم تھک چکی تھی اور کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں لے رہی تھی۔ اس لیے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور پھر دستک۔

"آ جائیں۔"

"شکریہ۔" شکیب اندر آتے ہوئے بولا۔

"آپ...... کوئی کام ہے؟" وہ دوپٹہ کندھوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں...... بس کچھ پوچھنا تھا۔" وہ بولا۔

"کیا؟"

"آپ غیر معمولی سنجیدہ تھیں سارا وقت کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"ویسے کیا مجھے اچھلنا کودنا چاہیے تھا؟" وہ بےزاری سے بولی۔

"نہیں کم از کم مسکرانا، خوش ہونا تو چاہیے تھا۔"

"بس میں اتنا ہی خوش ہوتی ہوں۔"

"سچ ہے یہ کیا؟"

"شکیب...... پلیز آپ ابھی سے سمجھ لیں کہ میں ایسی ہی ہوں۔"

"مگر پلیز کچھ خوشی نظر آئے۔"

"وہ وقت آنے دیں۔"

"حریم...... میں آپ سے بے حد محبت کرنے لگا ہوں، اس لیے وہم سا دل کو پریشان کرتا ہے۔"

''کیسا ہم؟'' کبھی کہا ہی نہیں کہ آپ بھی محبت کرتی ہیں۔''
''آپ نے ہاں محبتیں شادی کے بعد ہو جائیں گی۔'' اس نے سرد مہری
''سچ تو یہ ہے کہ ہمارا رشتہ گھر والوں کی مرضی سے جڑا ہے،
اختیار کی۔
''آپ پہلے بھی تو'' ''میں بہت تھکی ہوئی ہوں آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''شکیب پلیز میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ کچھ دیر چہل قدمی کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔
''باہر لان کا موسم بہت خوب صورت ہے، کچھ دیر چہل قدمی کرتے ہیں۔'' اس نے خاصی سختی سے کہا۔
''نہیں، میرا موڈ نہیں ہے اور بہت تھکی ہوئی ہوں۔'' اس نے خاصی سختی سے کہا۔
''او کے۔'' وہ کافی اجنبیت سے کہہ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
حریم کو افسوس سا تو ہوا مگر شکیب کی مرضی کے مطابق اظہار عشق کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ظہیر ہمایوں صاحب کچھ ذہنی دباؤ کے ساتھ آفس پہنچے تھے مگر آفس میں خمار کے شعری مجموعے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ پبلشر نے کتابیں آفس کے پتے پر بھیجی تھیں۔ انہوں نے بے تابی سے بنڈل سے کتاب نکالی۔ خوب صورت نیلگوں سا سرورق اس پر جگمگاتا ''خمار ہمایوں'' انہیں اچھا لگا خوشی سے سرشار کر گیا۔ کتاب کا عنوان ''محبت کی قسم'' پر وہ چونکے مگر پبلشر نے جس طرح کسی آرٹسٹ سے عنوان کو ڈیزائن میں ڈھلوایا تھا وہ بھی خوب صورت تھا۔ ان کے دل میں اتر گیا۔ کرسی پر بیٹھے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی ان کی پی اے اندر آ گئی۔
''سر... وہ صاحب آئے ہیں۔''
''کون صاحب؟''
''وہی جن کو آنے سے منع کیا تھا۔''
''مس... مجھے کون منع کر سکتا ہے، میں غیر نہیں ہوں۔'' نشید کمال نے اندر آ کر کہا۔ ظہیر ہمایوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
''مس آپ جائیں۔'' انہوں نے کہا تو وہ چلی گئی۔
''کیسے ہیں آپ؟''
''کیوں آئے ہو؟ منع کیا تھا ناں۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔
''آپ سے آج جواب لینا تھا۔''
''وہی جواب ہے جو کل دیا تھا۔ اب نکل جاؤ۔''
''ایک بات تو بتائیں آپ کو مجھ سے ضد ہے کیا؟'' نشید نے پوچھا۔
''شاید۔''
''تو ضد ختم کر دیں، کیوں کہ ضد آپ کو ختم کرنی پڑے گی۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔
''دیکھو... میں آرام سے کہہ رہا ہوں کہ یہ پیار محبت کی کہانی یہاں نہیں چلے گی، میری بیٹی کو تم میں کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔'' ظہیر ہمایوں طنزیہ مسکرا کر بولے۔
''خمار کی بات چھوڑیں، فی الحال اپنی ضد کی وجہ بتائیں، میں کیا ہوں؟ لولا ہوں، لنگڑا ہوں، غریب ہوں، بدشکل



ہوں، جاہل ہوں؟'' وہ بولتا چلا گیا۔
''ایک برائی ہی کافی ہے۔''
''کہ آپ کی بیٹی سے شدید محبت کرتا ہوں۔''
''تو کیوں کرتے ہو؟''
''محبت کیوں سے تعلق نہیں رکھتی؟''
''لڑکے... یہ سب باتیں اب فضول ہیں۔'' انہوں نے کہا۔
''کوئی فضول نہیں، اس کا توڑ ہے میرے پاس۔''
''میرے آفس ٹائم کو خراب مت کرو۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔
''آپ میری زندگی خراب مت کریں، میں خمار کے بغیر جی نہیں سکتا۔'' اس نے کہا۔
''بڑے... بڑے آئے مجنوں کہیں کے۔'' ظہیر ہمایوں طنزیہ بولے۔
''آپ تو مجنوں بن نہ سکے مگر میں آپ جیسا نہیں ہوں۔''
''کیا مطلب ہے اس بکواس کا؟'' وہ تڑخ کر بولے۔
''ظہیر ہمایوں صاحب، میں نے پوری کوشش کی کہ آپ کو احترام کے مقام سے نیچے نہ لانا پڑے مگر لگتا ہے کہ مجبوری ہے۔'' نشید نے بڑی تحمل سے رک رک کر کہا۔
''نوجوان... مجھے تم سے نہ احترام لینا ہے اور نہ احترام کی توقع ہے، تم جیسے فلمی ہیرو بننے والے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے، جانے کیوں تم عزت سے جانا نہیں چاہتے، مجھے گارڈز کو بلانا پڑے گا۔''
''نا... ناغلط سمجھا آپ نے۔ آپ کو احترام، عزت، اپنی ساکھ اپنے اسٹیٹس کا بڑا پاس ہے۔ اس کی خاطر تو آپ نے جائز ناجائز رشتے بنائے اور پچھتائے۔'' وہ مقابل ہو کر آہستہ آہستہ بولا۔
''شٹ اپ... کیا خرافات بک رہے ہو؟'' وہ بولے۔
''بات سنیں... یہ میری آخری بات ہے۔''
''بولو...'' وہ بولے۔
''یہ میری امانت رکھ لیں۔'' اس نے جیب سے انگوٹھی کی ڈبیا نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔
''کیسی امانت؟''
''یہ انگوٹھی بصد شوق خمار کو پہنا دیں یا...'' وہ رکا۔ انہوں نے گھورا۔
''یا...؟'' وہ پھر یا کہہ کر چپ ہوا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر بولا۔
''یا چاہت کو پہنا دیں فیصلہ آپ پر رہا۔'' ان کا جواب سنے بنا ان کا چہرہ دیکھے بنا وہ آفس سے باہر نکل گیا تھا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

# فیصلہ

نزہت جبین ضیاء

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو

شفیق احمد بازار سے لوٹے تو خلاف توقع گھر کا ماحول خاصا مکدر تھا۔ بڑی بیٹی پھولے ہوئے منہ کے ساتھ سامان سمیٹ رہی تھی، اس کے بچوں کا بھی منہ لٹکا ہوا تھا جبکہ صولت بیگم کا موڈ بھی ناخوشگوار تھا۔ سبزی کا شاپر تخت پر رکھتے ہوئے انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

''ہائیں..... خیر تو ہے، ناعمہ اچانک سے کہاں کی روانگی ہے؟'' رومال سے پسینہ صاف کرتے ہوئے تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بیٹی کو مخاطب کیا۔

''کہاں کی روانگی ہوگی بھلا؟ ملا کی دوڑ مسجد تک ہی ہوسکتی ہے، آپ کو تو پتہ ہے بڑھیا کو کیسے کیسے بہانے سوجھتے ہیں کہ بس بہو میکے میں نہ رہے، بلوالیا بہانہ کرکے۔'' بیٹی کے جواب دینے سے پہلے ہی صولت بیگم تلملا کر بولیں۔

''کیوں بھئی اب کیا مسئلہ ہوگیا انہیں؟'' شفیق احمد کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

''بڑھیا کی طبیعت خراب ہوگئی ہے، بیٹی ہاسپٹل میں ہے، ایک بہو دوسرے شہر میں ہے، ایک بہو ان کو لے کر ہاسپٹل بھاگ رہی ہے، گھر کو دیکھنے کے لیے کسی چوکیدار کی ضرورت ہے تو چھوٹی بہو یاد آگئی۔'' صولت بیگم بدستور جلال میں بولیں۔

''ارے یار..... اگر پتہ ہوتا کہ آج تم جارہی ہو تو صبح سے مشین ہی لگالیتیں، دیکھو تو کتنے کپڑے جمع ہوگئے ہیں، اب تمہاری ماں تو دھو نہیں سکتیں، نہ جانے کب تم واپس آؤ۔'' شفیق احمد نے صحن کے کونے میں پڑے میلے کپڑوں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے ہوئے بیگم کی بات کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔

''ابا..... آپ ٹینشن نہ لیں، میں زیادہ نہیں رکنے کی.....'' شاپر میں مزید کپڑے ٹھونستے ہوئے ناعمہ نے پلٹ کر ابا کی طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار بیزاری سے کہا۔

''ہاں تم بھی بیماری کا بہانہ کرکے واویلا مچا کر واپس آجانا۔'' صولت بیگم نے راہ دکھائی تو ناعمہ نے سر ہلایا۔

''اچھا یہ بتاؤ، رات کے لیے ہانڈی وغیرہ پکالی کہ نہیں؟'' شفیق احمد گھر داری کی الجھنوں میں ہی الجھے ہوئے تھے۔



''پکادی ہے ابا۔'' اس بار ناعمہ جھنجلائی اور اپنی جھنجلاہٹ چار سالہ بیٹی ایمل پر نکالتے ہوئے اسے دھکا دیا۔

''تم تو پیچھے ہٹو، جاکر چپل پہنو، رکشے والا آتا ہی ہوگا۔'' ایمل منہ بسورتے ہوئے صحن کی طرف چلی گئی اور ناعمہ نے شاپر سنبھالے اور خود بھی صحن کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک تو ناعمہ کو خود بھی سسرال سے الرجی تھی اوپر سے سونے پہ سہاگا والدین کی بے جا سپوٹ نے مزید ہوا دے رکھی تھی۔ تب ہی تو اس کا دل سسرال کے نام سے بھی گھبرانے لگتا تھا۔ اب اگر شوہر ملک سے باہر ہے تو اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ لڑکی کا سسرال میں دل ہی نہ لگے، جیسے رشتہ صرف شوہر سے ہی ہو اور کسی سے کوئی واسطہ نہ کوئی رشتہ۔ اوپر سے گاہے بگاہے اماں اور ابا کا یہ احساس دلاتا۔

''تمہارا دل نہیں لگتا ہوگا، جب گھر میں مرد ہی نہ ہو تو بھلا گھر میں رونق کہاں رہتی ہے؟ سب کی خدمتوں کے لیے ہم نے تمہیں نہیں بیاہا، ہاں تو بھرا پورا گھر ہے، یہاں تو ہم دو بوڑھے اکیلے پڑے رہتے ہیں۔'' بس یہی باتیں اور ایموشنل کرنے والے جملوں سے ناعمہ کو اپنا آپ قابل رحم تو لگتا ہی ساتھ ہی اماں اور باوا سے بھی محبت دو چند ہوجاتی اور ایسے موقعوں پر وہ منہ بسور کر اور خود کو دنیا کی مظلوم ترین عورت تصور کرتے ہوئے بادل ناخواستہ دل پر منوں ٹنوں بوجھ اور ساس، نندوں اور جٹھانی کے لیے صلواتیں لیے رخت سفر باندھتی تھی۔

☆......☆......☆

شفیق احمد اور صولت بیگم کی دو بیٹیاں ناعمہ اور راضیہ تھیں۔ دو بیٹیوں کے بعد بیٹے کی شدید خواہش

پیدا ہوئی لیکن راضیہ کے بعد دوبارہ یہ امید بر آتے آتے رہ گئی اور صولت بیگم کو اندرونی پیچیدگیاں ہونے کی وجہ سے آگے مزید اولاد کا راستہ بھی بند ہوگیا۔ شفیق احمد سرکاری ملازم تھے، جاب معمولی ہی تھی پر گھر اپنا تھا اس لیے جیسے تیسے گزر بسر ہو ہی جاتی، رشتے داروں سے بھی خاص اچھے تعلق نہ تھے اس لیے اپنی بیوی، بچیوں اور نوکری تک ہی معروفیت رہی تھی۔ صولت بیگم قدرے سست اور کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا رہتیں ساتھ ہی دونوں میاں بیوی کو بیٹا نہ ہونے کا قلق بھی ہمیشہ ہی رہتا، دونوں بچیوں نے نہایت کم عمری سے ہی گھر داری کے ساتھ ساتھ اماں کی بیماری کو جھیلنا سیکھ لیا تھا۔ شفیق احمد کو اپنی بیوی سے حد درجہ محبت تھی اس لیے ان کو آرام دینے کے چکر میں وہ ناعمہ کے ہاتھ کی بنی کچی پکی اور جلی ہوئی روٹیاں اور بدمزہ سالن بھی مزے لے لے کر کھا لیتے ساتھ ساتھ دونوں بچیاں پڑھائی بھی کرتیں، پابندی سے اسکول نہ جانے کی وجہ سے پڑھائی میں بھی خاصی کمزور تھیں۔ دن گزرتے رہے اور اب دونوں بچیاں بڑی ہوگئی تھیں۔ رشتے دار اور محلے والے اس بات کا احساس دلانے لگے تھے کہ اب محلے اور خاندان کی دوسری بچیوں کی طرح ان دونوں کے ہاتھ بھی پیلے ہوجانے چاہیں۔ جب اس روز محلے کی بزرگ خاتون اپنے بیٹے کی شادی کا دعوت نامہ لے کر ان کے گھر آئیں تو حسب معمول صولت بیگم اپنے پلنگ پر لیٹی ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھیں، سامنے ہی شفیق احمد عادتاً آلتی پالتی مارے بیٹھے چائے پی رہے تھے ساتھ ساتھ بیگم کی خوشنودی کے لیے ڈرامے کے کسی کردار پر کھل کر داد دیتے تو کبھی افسردگی کا اظہار یعنی جیسا سین ہوتا اور بیگم کے چہرے کے ایکسپریشن ہوتے شفیق احمد سیم وہی کرنے کی کوشش کرتے۔ ناعمہ نے مشین لگائی ہوئی تھی اور کپڑے دھو رہی تھی جبکہ راضیہ جھاڑو لگا رہی تھی۔

"اماں...... جنت خالہ آئی ہیں۔" جنت خالہ کو دروازے پر دیکھ کر راضیہ نے سلام کیا اور صولت بیگم کو آواز دے کر اطلاع دی اور جنت خالہ کو لے کر کمرے کی طرف آ گئی۔ ڈرامے کا اینڈ چل رہا تھا اس وقت جنت خالہ کی آمد صولت بیگم کو سخت ناگوار گزری، انہوں نے برا سا منہ بنا کر ٹی وی میوٹ کیا اور بادل ناخواستہ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کرنے لگی تھیں۔

"سلام جنت خالہ...... آیئے آیئے، اتنی دوپہر میں کیوں نکلیں بھلا، گرمی نہ لگ جائے۔" دل کی بات ہمدردی کی شال میں لپیٹ کر اچھالی۔

"وعلیکم السلام! ارے وقت ہی نہیں ملتا، اتنے ڈھیر سارے کام پڑے ہیں، اپنے ایوب میاں کی شادی کا کارڈ لائی ہوں، شفیق میاں ضرور آنا ہے آپ سب نے۔" انہوں نے بیٹھتے ہوئے کارڈ شفیق احمد کی جانب بڑھایا۔

"ارے واہ خالہ بہت بہت مبارک ہو...... ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور آئیں گے۔" شفیق احمد نے کارڈ تھامتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ناعمہ...... جنت خالہ کے لیے شربت لے کر آؤ۔" صولت بیگم نے بیٹی کو آواز دی۔

"نہیں صولت اس تکلف کی ضرورت نہیں، ابھی تمہارے پڑوس والوں کے ہاں سے کولڈ ڈرنک پی کر آئی ہوں۔ ویسے اپنی ناعمہ اور راضیہ کی کہیں بات لگی کہ نہیں؟" جنت خالہ نے ملائمت سے شربت کے لیے انکار کیا اور پھر سر جھکا کر دھیمے لہجے میں صولت بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

"ارے ابھی کہاں خالہ...... ابھی تو سوچا بھی نہیں، چھوٹی ہیں دونوں۔" صولت بیگم جو ان کے سوال پر ایک دم چونکی تھیں قدرے سنبھل کر بولیں۔

"ارے بھئی دیکھتے دیکھتے قد کاٹھ نکال لیتی ہیں، کھیرے، ککڑی کی طرح بڑھ جاتی ہیں لڑکیاں،



ان کو تو جتنی جلدی خیر سے رخصت کردو اچھا ہے۔ ناعمہ تو میری رومیعہ کے ساتھ کی ہے، ماشاء اللہ اس کی شادی کو سال ہوگیا ہے، میں تو کہتی ہوں تم بھی سنجیدگی سے سوچو۔ عمر بڑھ جائے تو پریشانی بھی بڑھ جاتی ہے، راضیہ تو ناعمہ سے بھی لمبی ہوگئی ہے ماشاء اللہ۔" بات تو سو فی صد درست تھی لیکن جاتے ہوئے جنت خالہ نے دونوں میاں بیوی کو سوتی نیند سے جگا دیا تھا۔

"لو بھلا...... اب خود نے اپنی بیٹی کی شادی بیس سال کی عمر میں کردی تو ضروری ہے کہ ہم بھی بچپن میں ہی بیٹی بیاہ دیں۔" صولت بیگم کے دل پر جا کر جنت خالہ کی بات لگی تھی تب ہی یہ منفی اثرات تھے۔

"ویسے بیگم بات تو خالہ نے ٹھیک کہی، میرا خیال ہے کہ ہمیں رشتے کے لیے کہہ دینا چاہیے، سو چکر ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوتے ایک دو سال تو لگ ہی جائیں گے۔" شفیق احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ کیسی باتیں کررہے ہو شفیق احمد...... ناعمہ چلی گئی تو راضیہ اکیلے کیسے گھر سنبھالے گی؟ اور پھر اس کی شادی، ہائے۔" صولت بیگم نے سینے پر ہاتھ مارا۔

"مجھے تو سوچ سوچ کر ہی ہول اٹھتے ہیں...... ہمارا کیا ہوگا؟ ہم بڑھاپے میں تو مر ہی جائیں گے۔"

"اف نیک بخت کیسی بدی زبان نکال رہی ہو...... اللہ نہ کرے، میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اپنی راضیہ کو گھر داماد لڑکا ہی ڈھونڈوں گا، ناعمہ چلی گئی بھی تو راضیہ ہمیشہ ساتھ رہے گی، ہم اکیلے بھی نہیں ہوں گے اور گھر کی ذمے داری بھی وہ خود ہی سنبھال لے گی۔" شفیق احمد نے بیوی کو خدشات سے نکالتے ہوئے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"واہ...... یہ بات کی ناں تم نے پتے کی۔" صولت بیگم کے چہرے کا رنگ ایک دم ہی بدل گیا تھا۔ شفیق احمد نے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے بہت اچھا سوچ رکھا تھا۔

ادھر ادھر رشتے کی بات چلی...... ناعمہ اور راضیہ دونوں واجبی سی شکلوں والی گندمی رنگت والی لڑکیاں تھیں، آج کل کے زمانے میں ویسے بھی اچھے رشتے ملنا مشکل ترین تھا پھر واجبی شکل اور فنانشلی طور پر بھی سفید پوش گھرانے کی لڑکیوں کے لیے تو یہ مسئلہ گمبھیر ہوگیا ہے۔ ابھی تک تو صولت بیگم اس معاملے میں ٹھنڈی بیٹھی تھیں پہلے جنت خالہ اور پھر ایک دو لوگوں کے اشاروں پر انہوں نے بادل ناخواستہ ارادہ کرلیا، وہ اس غلط فہمی میں تھیں کہ رشتے ان کو راہ چلتے آسانی سے مل سکتے ہیں۔ احساس تب ہوا جب مسلسل دو سال تک آنے والے رشتے ایک بار آ کر دوبارہ واپس نہ پلٹے لیکن اس عرصے میں یہ ہوا کہ جہیز کے حوالے سے تیاری ہوتی رہی۔ آخر کار ایک فیملی کی آنے والی تین خواتین نے ناعمہ کو پسند کرلیا تھا۔ لڑکے کی والدہ، بہن اور ایک بھاوج آئے تھے، دقیانوسی قسم کے لوگ تھے لیکن پیسہ تھا، لڑکا بھی معمولی پڑھا لکھا تھا لیکن سب سے زیادہ پرکشش بات یہ تھی لڑکا دبئی میں تھا، اب وہاں معمولی جاب تھی یا اچھی، اس بات سے سروکار نہ تھا، پیچھے سے ہی پیسے والے تھے، لڑکے کے والد حیات نہیں تھے کسی زمانے میں ان کا ذاتی ہوٹل تھا جہالت تھی لیکن پیسہ بھی تھا سو پیسے نے جہالت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ رشتہ طے ہوگیا اور کیونکہ لڑکا واپس جانے والا تھا اس لیے شادی جلد ہی طے ہوگئی اور ناعمہ بیاہ کر سسرال چلی گئی۔ صولت بیگم اور شفیق احمد ہواؤں میں اڑ رہے تھے کہ بیٹی بھی شادی کے بعد دبئی چلی جائے گی، اتنے پیسے والے لوگ ہیں دو تین گھر اور کئی پلاٹس ہیں، اب چاہے ان کو بات کرنے کا سلیقہ ہو یا نہ ہو...... کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہو کہ نہ ہو بس دبئی نے ساری برائیاں پس پشت ڈال دی تھیں۔

ناعمہ بھی خوش تھی، شادی کے شروع دنوں میں

وعدوں کا سلسلہ رہا اور پلک جھپکتے ایک ماہ بیت گیا، نہال کے واپس جانے کا وقت آ گیا تھا۔ گھر میں نہال کی والدہ بانو، دو جٹھانیاں ارم اور زرین اپنے دو دو بچوں کے ساتھ رہتے تھے، ایک شادی شدہ نند تھی جس کے تین بچے تھے دونوں جیٹھ بھی دبئی میں ہی تھے۔ نہال کے جانے پر نائمہ بہت اداس ہوئی تھی اور تب سے ہی اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھی تھی۔ باری باری جٹھانیاں بھی گئیں اور کہا کہ باہر آ جاؤ ہمارے ساتھ بیٹھو دل لگ جائے گا لیکن وہ منہ لپیٹے لیٹی رہی۔

دوسرے دن اپنا بیگ تیار کر کے میکے جانے کی تیاری کر لی۔ ساس نے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں امی کے گھر جا رہی ہوں۔ امی نے بلوایا ہے، ویسے بھی نہال چلے گئے، کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے مجھے۔" وہ رونے لگی۔

"ایسے نہیں ہوتا..... جمال اور کمال بھی اپنے [illegible] چلے گئے تھے، تم دل لگاؤ گی تو دل لگے گا ناں۔" ساس کو شاید برا لگا تھا۔

"لگا لوں گی دل بھی، ابھی تو جانے دیں..... اماں ابا انتظار کر رہے ہوں گے۔" نائمہ نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

ساس دیکھتی رہ گئیں..... ساس چاہتیں تو سخت لہجے میں بات کر سکتی تھیں لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہیں، نائمہ نے یہی معمول بنا لیا تھا۔ ایک ہفتہ سسرال میں رہتی تو دس دن میکے میں..... کبھی کوئی بہانہ، کبھی پھر اپنی طبیعت تو کبھی کوئی اور مسئلہ۔ خیر سے پاؤں بھی بھاری تھا، اس وجہ سے نہال بھی کچھ نہیں کہتا جیسے تیسے وقت گزرا اور نائمہ کی گود میں بیٹی آ گئی۔ نہال بھی پاکستان آیا، بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ نائمہ پیچھے پڑ گئی کہ اسے دبئی لے کر جائے۔ نہال نے تسلی دی کہ جلد بلوا لے گا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے، نائمہ والدین کے آگے ہمیشہ خود کو مظلوم ہی پیش کرتی، کام کی زیادتی، نند کا بار بار آنا، جٹھانیوں کی سستی اور ساس کی دو نظری کے واقعات بنا بنا کر سناتی۔ صولت بیگم آگ بگولہ ہو کر بپھر جاتیں تب نائمہ روک دیتی۔

"نہیں اماں کم از کم پیسے کی کمی تو نہیں ہے، آپ رہنے دیں، میں خود نہال سے بات کرلوں گی۔"

دبئی کے حالات کچھ خراب ہوئے تو نہال کی نوکری کا مسئلہ بن گیا، نائمہ کا جانا کھٹائی میں پڑ گیا۔ نائمہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی، اسی عرصے میں راضیہ کے لیے گھر داماد لڑکے کا رشتہ ڈھونڈ رہے تھے کہ..... راضیہ نے بم چھوڑ دیا کہ وہ کسی لڑکے کو پسند کر بیٹھی اور ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لڑکا اسلام آباد کا رہائشی تھا، گھر بار اور جاب بھی وہیں پر تھی، یہ بات سن کر شفیق احمد اور صولت بیگم کے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ وہ تو راضیہ کو ساتھ رکھنے والے تھے کہ اس نے یہ بم چھوڑ دیا، سختی کی گئی، پابندیاں لگائی گئیں لیکن راضیہ نے صاف کہہ دیا تھا۔

"وہ بھاگ بھی سکتی ہے۔"

"ہائے اللہ....." صولت بیگم نے اسے بری طرح دھنک ڈالا، شفیق احمد بے دم ہو کر چارپائی پر گر گئے لیکن راضیہ کی "ہاں" میں نہ بدلی، بدنامی مول لینے سے بہتر یہی تھا کہ اسے عزت سے رخصت کر دیا جائے سو شفیق احمد نے بھی یہی کیا۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن اس سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتے تھے، دو ہی تو بیٹیاں تھیں جو آخری وقت کا سہارا تھیں۔ بڑھاپے کی لاٹھی اور ایک لاٹھی تو کسی قدر کم ظرف نکلی تھی، صولت بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ بہرحال ہونی تو ہو کر رہتی ہے، چاہے انسان چاہے یا نہ چاہے۔ راضیہ اسلام آباد چلی گئی تو صولت بیگم کے ہاتھ



پاؤں پھول گئے، لے دے کے نائمہ رہ گئی تھی اور نائمہ کو ہر صورت ساتھ رکھنا ان لوگوں کی مجبوری تھی سو نائمہ والدین کی مجبوری سمجھتے ہوئے شوہر کے گھر اور سسرالی رشتوں کو مکمل طور پر پس پشت ڈال کر صرف ماں باپ کے اکیلے پن کے بارے میں سوچتے ہوئے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ صولت بیگم کو کام کی عادت نہیں تھی اور شفیق احمد بیمار رہنے لگے تھے، شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے اب تو نائمہ باہر جانے کی ضد چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس عرصے میں دو بچے بھی ہو گئے تھے، سسرال والے اور شوہر بھی کب تک چپ رہتے اب ساس اور جٹھانیاں باقاعدہ جھگڑنے لگی تھیں، نہال سے بھی اس بات پر کافی بار لڑائی ہو چکی تھی کہ نائمہ سسرال میں رہنا ہی نہیں چاہتی۔ اسے صرف اور صرف میکے کی لگی رہتی ہے اوپر سے والدین کی ہائے ہائے اور اکیلے پن کا رونا، صولت بیگم رو رو کر اللہ پاک سے گلے کرنے لگتیں (نعوذ باللہ)

"ہائے تیرے خزانے میں کون سی کمی تھی ایک بیٹا دے دیا ہوتا تو یوں بیٹی کے محتاج تو نہ ہوتے۔" اماں کی فریاد پر نائمہ کا دل تڑپ جاتا۔

"ہائے اماں..... ایسے نہ کہو میں ہوں ناں اگر بیٹا نہ ہوا تو کیا ہوا..... میں نے کوئی کمی چھوڑی ہے کیا؟"

"ہاں وہ تو ہے مگر..... وہ بڑھیا بھی عذاب بنی رہتی ہے۔" اشارہ نائمہ کی ساس کی طرف ہوتا۔

"تو میں کون سا ان کی بات مانتی ہوں اماں۔" نائمہ فخر سے کہتی تو صولت بیگم فاتحانہ انداز میں مسکرا دیتیں۔

"تو اور کیا..... ہم نے بیٹی بیاہی ہے بیچی تھوڑی ہے۔" وہ سینہ تان کر کہتیں، انہی تو تو میں میں اور جھگڑوں میں مزید ایک سال بیت گیا۔ اب بھی پچھلے پندرہ دن سے نائمہ میکے میں ہی تھی کہ ساس کے فون آنے پر تن فن کرتے ہوئے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ رخت سفر باندھا تھا۔ ایسا جیسے کہ وہ اپنے گھر نہیں بلکہ جنگ کے لیے سرحد پار جا رہی ہو، جیسے کوئی معرکہ سر کرنے جا رہی ہو۔

نائمہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شفیق احمد نے بیگم کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کاش ہم نائمہ کو اتنے بھرے گھر میں نہیں بیاہتے..... اکیلا لڑکا ہوتا تو پابندی بھی نہ ہوتی۔" صولت بیگم ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"اری نیک بخت پاگل ہوئی ہے کیا..... سوچ تو سہی، بھلا میری پنشن سے اتنا اچھے سے گزارا ہو سکتا ہے کیا؟ وہ تو ہر ماہ نائمہ ڈھیر سارے پیسے لے آتی ہے تو ہمارے بھی عیش ہو جاتے ہیں۔ تنگی بندھی پنشن سے تو اس مہنگائی میں بجلی اور گیس کے بل ہی بھرے جا سکتے ہیں، تمہاری دوائیاں، میری دوائیاں، پھل فروٹ، مرغی، گوشت یہ سب اخراجات نائمہ تو پورے کرتی ہے، ساتھ میں پورا گھر بھی سنبھال لیتی ہے اگر اکیلا کم تنخواہ دار لڑکا ہوتا تو اپنا گزارا کرتی کہ ہمارے خرچے پورے کرتی؟" شفیق احمد دور کی کوڑی لائے تھے۔

"ہاں شفیق احمد..... تم ٹھیک کہتے ہو، بس یہ جو دو چار دن کے لیے بھی جاتی ہے تو دل حلق میں آ جاتا ہے، مجھ سے روٹیاں، سالن نہیں پکائے جاتے، عادت ہی نہیں رہی۔"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ نہال کا دماغ خراب نہ ہو جائے اور وہ سختی پر نہ آ جائے اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟" خدشات کے پیش نظر صولت بیگم کی آواز کپکپانے لگی تھی۔

"کاہے کو پریشان ہوتی ہو تم..... ایسا وقت نہیں آئے گا، نہال کی زبان بھی بہت لمبی ہو گئی ہے، وہ بھی ماں کی باتوں میں آ کر بہت جھگڑنے لگا ہے

ناعمہ... اور میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا ہے، ناعمہ خود بھی مزا آگئی ہے اب تو بحث جھک سے، میں ناعمہ کو بولوں گا، اگر زیادہ چخ چخ کرے تو گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دینا اور ... اور گھر چھوڑنے کی بات کرلینا، اولاد سب سے بڑا ہتھیار ہے اور مرد ہو یا عورت اولاد کے لیے ایک دوسرے کی شرائط بھی مان لیتے ہیں، یہ ان کی مجبوری ہوتی ہے، اب رافیہ سے تو کوئی امید نہیں کہ وہ بڑھاپے میں ہمارا ساتھ دے، وہ خود مہمانوں کی طرح آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔" شفیق احمد ایک لے کو رکے۔ صولت بیگم منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی آنکھوں سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔

"شفیق احمد، اللہ نہ کرے، یہ کیا کہہ رہے ہو بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟" ان کا لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔

"صولت بیگم یہ ہماری مجبوری ہی نہیں ہماری ضرورت بھی ہے، اب ہمارا کوئی بیٹا تو نہیں کہ بیٹا باہر کے اور بہو گھر کے کام سنبھالے، نہ تم اس قابل ہو نہ ہی میری صحت اور عمر اس قابل ہے کہ ہم تنہا رہ پائیں، ہمیں سہارے کی ضرورت ہے، ہمیں ساتھ کی ضرورت ہے، اگر خدانخواستہ ہاسپٹل جانے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی لے کر جانے والا ہو، کوئی سنبھالنے والا تو ہو۔ میں خدانخواستہ یہ نہیں چاہتا کہ بیٹی کا گھر خراب ہو، بس تمہارا اور اپنا مستقبل سیکور کرنا چاہتا ہوں۔" شفیق احمد کی آواز رندھ گئی تھی۔

☆...☆...☆

ناعمہ جو جلدی جلدی اور جھنجلاہٹ میں گھر سے نکلی تو صحن میں کرسی پر رکھا اپنا پرس اٹھانا بھول گئی تھی۔ وہ اپنا پرس لینے اندر آئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ماں باپ کی آوازوں کو سن کر دروازے کے قریب رک گئی تھی، کچھ دیر وہ خاموش کھڑی باتیں سنتی رہی، اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی، شفیق احمد کی آواز، ان کی باتیں سن کر ناعمہ کا سر گھوم گیا تھا۔

"اف..." اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور الٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔ اس کا دماغ مسلسل سوچوں کی زد میں تھا۔ کیا کوئی ماں باپ اس حد تک خود غرض ہوسکتے ہیں؟ لڑکیوں کا دل اگر سسرال میں نہ لگے تو مائیں ان کو سمجھاتی ہیں، سسرال میں رہنے، بسنے اور دل میں گھر کرنے کے طریقے بتاتی ہیں، منفی باتوں کو بھی مثبت سوچ میں ڈھال کر سسرالی ماحول میں ڈھل جانے کی تلقین کرتی ہیں لیکن یہاں... یہاں تو ہمیشہ اماں اور ابا نے اس کی سپورٹ کیا، یہی باور کروایا کہ تم بیاہ کر گئی ہو، تم خدمتوں کے لیے نہیں گئی، تم اپنی مرضی سے نیا، شوہر کے بغیر بھلا گھر میں رہ کر کیا کروگی؟ یہ تکلف باتیں اور منفی سوچیں ہی ہمیشہ ذہن میں ڈالی گئیں۔

والدین کے خلاف منفی سوچیں ابھرنے لگی تھیں۔ تب ہی اچانک اسے ماں باپ مظلوم محسوس ہونے لگے، شاید وہ بھی مجبور ہوں، وقت، حالات اور عمر کا بھی کچھ تقاضا تھا۔ اپنے آپ کو سیکور کرنے کی ضرورت بھی تھی اور کوئی دوسرا چارہ تھا نہ ہی کوئی راستہ۔ بے شک یہ ان لوگوں کی مجبوری تھی لیکن اس کا بھی کوئی دوسرا طریقہ نکالا جاسکتا تھا۔ بھلا یہ کیسا خراج وصول کرنا چاہتے تھے؟ ناعمہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ تب اسے یہ بھی احساس ہوا کہ جیسے ابھی تھا، وہ اس کا سسرال تھا، بظاہر کوئی پابندی تھی نہ سختی اور وہ بھی ناعمہ کے مزاج پر گراں تھا۔ الجھن تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی تب اس کو ساس اور شوہر نظر آئے جن سے وہ اپنی طور پر بات کرسکتی تھی۔

☆...☆...☆

خلاف توقع دو دن بعد ہی ناعمہ کو گھر میں دیکھ کر شفیق احمد اور صولت بیگم حیران کم اور خوش زیادہ ہوئے تھے۔

"ارے واہ... اتنی جلدی جان چھوٹ گئی بڑی بی سے... شکر ہے کوئی پنگا نہیں ڈالا۔" صولت بیگم نے کہا۔



"ہاں بھئی اب ادھر ہی قیام کرلینا اور وہاں کمرہ بھی بنا پڑا ہے اس کی صفائی بھی کرنی ہے، کپڑے بھی دھونے ہیں اور..." شفیق احمد ابھی شاید اور کچھ کہنے جارہے تھے کہ ناعمہ نے پلٹ کر گہری نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"جی ابا جی بالکل فکر مت کریں... ان شاء اللہ آپ کے گھر کی سارے کام خوش اسلوبی سے پورے ہوجائیں گے، بے شک آپ لوگوں کو سپورٹ کی ضرورت ہے لیکن ابا جی، اماں دوسری جانب میرا اپنا گھر بھی ہے، میرا سسرال اور سسرال والوں کا بھی حق ہے مجھ پر، ویسے بھی شادی شدہ بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد ہیں تو والدین کے لیے اس سے بڑی خوشی اور اطمینان بھلا کیا ہوگا؟" ناعمہ نے تحمل مزاجی سے ٹھہر ٹھہر کر "آپ کے گھر" اور "میرا اپنا گھر" پر خاصا زور دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"ہائیں..." دونوں میاں بیوی بری طرح چونکے، ایسی بات اور ایسے جملوں کی قطعی توقع نہیں تھی۔

"ک... کیا مطلب؟" صولت بیگم نے ابرو چڑھا کر سوال کیا۔

"اماں... میں جانتی ہوں کہ اکیلے پن اور بڑھاپے کے ساتھ بیماریوں کی وجہ سے آپ لوگ پریشان رہتے ہیں تو اس کا حل یہ تو نہیں کہ میں مستقل یہاں آجاؤں، میں، نہال اور امی (ساس) نے مل کر اس کا حل نکال لیا ہے... امی (ساس) کے دور پرے کے سسرالی غریب رشتے دار ہیں، میاں بیوی ہیں... بچہ کوئی نہیں ہے، میاں کی نوکری نہیں اور رہنے کو گھر بھی نہیں تو ہم نے مل کر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ سردار بھائی اور ان کی بیوی کو اوپر والا پورشن دے دیں، ویسے بھی وہ کمرہ خالی پڑا ہے... دونوں میاں بیوی رہیں گے جمیلہ بھابی گھر کے سارے کام کرلیں گی اور سردار بھائی باہر کے کام کرلیں گے۔ بہت نیک، شریف اور عبادت گزار لوگ ہیں۔ امی اور نہال ان کی شرافت اور سادگی کی گارنٹی بھی لے رہے ہیں، وہ لوگ آپ دونوں کا بہت خیال رکھیں گے بوڑھے میں رہنے کو اور وقت کا کھانا (کھانا بھی دونوں ہی بنائیں گے) بس یہی ضرورت ہے ان کی، ان کا بھی مسئلہ حل ہوجائے گا اور آپ لوگوں کو بھی اکیلے پن کی شکایت نہیں ہوگی اور ہاں ابا..." اس نے رک کر شفیق احمد کی طرف دیکھا۔

"اگر ابا جی آپ بالکل فکر نہ کریں... آپ ہمارے ماں باپ ہیں، آپ کا حق ہے ہم پر، راضیہ اور میں مل کر یہ پورے کریں گے، اللہ کے واسطے آپ انکار نہ کریں، یہ ہم پر ظلم ہوگا۔" ناعمہ جذباتی ہوئی اور باپ کے ہاتھ تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ شفیق احمد اور صولت بیگم کے چہروں کے رنگ بھی بدل چکے تھے، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیا کہیں۔ وہ دونوں شرمندگی محسوس کررہے تھے، ان کی اولاد نے مل کر کیسا حل نکالا تھا، دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ناعمہ بڑھ کر دونوں کے گلے لگ گئی تھی۔

☆...☆...☆

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے... کہیں ماں باپ بھی خود غرضی دکھا دیتے ہیں اگر ناعمہ کی بروقت آنکھ نہ کھلتی تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا، ناعمہ ماں باپ کے مطمئن چہرے دیکھ کر ہی مطمئن ہوگئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اچھا ہوا کہ اس روز وہ پرس لینے کے لیے واپس آگئی تھی اور آج درست فیصلہ کرچکی تھی۔

"واٹ..... !اس دور میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ تمہارے کوئی اور رشتہ دار نہیں تھے جو ان لوگوں کو روکتے ٹوکتے۔ لوگوں کو چھوڑو تم دونوں نے کس خوشی میں اپنی زندگی کی باگ دوڑ اپنی تائی کو سنبھالنے دی۔" صفا کی آواز اچھی خاصی اونچی ہوگئی تھی زریں کی پوری بات سن کر۔

"ارشد تائی کا بیٹا ہے، مجھ سے چار پانچ سال بڑا ہے معذور ہے، ٹانگیں بچپن میں کسی مرض کے باعث ناکارہ ہوگئی تھیں، اب وہیل چیئر پر ہے، معذوری کی وجہ ہے یا تائی کی سی فطرت کہ دماغ اور مزاج ماں سے بھی زیادہ تیز ہے..... کسی بھی دیر سویر کی صورت میں چیختا چلاتا ہے اور میرا پارلر سے چھٹیاں اور کبھی کبھار کالیٹ ہوجانا بھی اسی کے سبب ہے کہ بہت دفعہ وہ مجھے اس طرح سے مختلف کاموں میں مصروف کرلیتا ہے کہ میں کام چھوڑ کر آ جاؤں تو گھر میں ایک طوفان آجاتا ہے اور تائی کی خوشی ارشد کی خوشی میں چھپی ہے۔"

"تم..... تم کس خوشی میں اس کے کام کرتی ہو اور وہ کس حق سے تمہیں کام کے لیے کہتا ہے بھئی؟ وہ معذور ہے، اس کی ماں کے ہاتھ پاؤں تو سلامت ہیں وہ کرے بیٹے کے کام، او مائی گاڈ کس طرح کا ماحول ہے تمہارے گھر کا اور تم سروائیو کیسے کررہی ہو؟ میرا تو سن کر ہی دماغ کھول رہا ہے۔" صفا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی تائی اور ان کے بیٹے کی گردن جاکر مروڑ دے۔

"یہ پارلر اور آپ میرے اس تاریک اور گھٹن زدہ زندگی میں ہوا اور روشنی کا ایک جھونکا ہیں، تائی کو میری تنخواہ سے سروکار ہے اور مجھے اس وقت سے جو میں یہاں گزار کر جاتی ہوں تو باقی ماندہ دن اور رات اسی کے سہارے گزارنا قدرے آسان ہوجاتا ہے۔"

"یار..... کس دنیا کے لوگ ہو تم اور تمہارا بھائی؟ جوان جہان بندہ ہے، تھپڑ چھوڑ ایک جوانوں والی آنکھ ہی دکھ لے اس تائی اور اس کے بیٹے کو، مجال ہے جو تم پر ظلم تو ایک طرف، ٹیڑھی آنکھ بھی دیکھ جائیں۔" صفا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"بھائی....." وہ تلخی سے مسکرائی۔

"مجھ پر تو پھر بھی تائی ہلکا ہاتھ رکھ جاتی تھیں، بھائی کو تو انہوں نے مار مار کر نفسیاتی طور پر اتنا کمزور کردیا ہے کہ وہ اونچی آواز سے بھی ڈر جاتا ہے، کسی سے بالمشافہ بات چیت کا تو تصور ہی نہیں کرسکتا وہ جیسے اس کی آواز کانپتی ہے، الفاظ ٹوٹتے ہیں، ویسے ہی جسم پر رعشہ طاری ہوجاتا ہے۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے اس کو۔" صفا نے تیزی سے کہا۔

"ڈاکٹر....." وہ تلخی سے ہنس دی۔

"بڑی سے بڑی جسمانی بیماریوں پر بھائی اور میں خود ہی تڑپ تڑپ کر پھر بھلے چنگے ہوجاتے ہیں..... یہ تو پھر نفسیاتی مسئلہ ہے اس کا۔" صفا نے سر بے اختیار ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

☆......☆......☆

"ماشاءاللہ بہت اچھی تربیت کی ہے تم نے اپنی بچیوں کی، ماؤں کے لیے بیٹیوں کی تربیت کے حوالے سے مثال ہی قائم کردی ہے تم نے..... ورنہ آسان تھوڑی ہوتا ہے ایک اکیلی عورت کے بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا وہ بھی اس صورت جب وہ نہ تو معاشی طور پر مضبوط ہو نہ ہی اس کو کسی مرد کا سہارا حاصل ہو۔" ہاجرہ نے چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"انسان کا کوئی کمال نہیں ہوتا بہن، جو بھی ہوتا ہے پروردگار کی طرف سے ہوتا ہے، اس کا جتنا شکر ادا کرو وہ کم



ہے۔" بڑی بیگم نے عاجزی سے جواب دیا۔

مومن کے بے حد اصرار پر وہ آج بڑے بیگم کے گھر آئی تھیں لیکن ابھی ان کا مومن کے رشتے کے حوالے سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ ان کو پہلے اس حوالے سے ٹٹولنا چاہتی تھیں کسی اور کا حوالہ دے کر اندر ہی اندر ان کی کیفیت عجیب سی بھی ہورہی تھی کہ اب تک بڑی بیگم کا رویہ ان سے نہایت حوصلہ افزا تھا۔ تاہم وہ جانتی تھیں کہ ایسا صرف اس وقت تک تھا جب تک وہ ان کی بیٹیوں کی شادی کے حوالے سے بات نہ کرتیں۔

"نسرین.....!" کچھ سوچ کر انہوں نے بات شروع کی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم نے بہت مشکل وقت دیکھا ہے، سب کچھ ہمارے سامنے کا ہی ہے تمہاری زندگی کے حوالے سے بہت قدر ہے میرے دل میں تمہاری قربانیوں کی....." وہ لفظوں کا چناؤ نہایت سوچ سمجھ کر اور ان الفاظ کا استعمال سنبھل سنبھل کر کررہی تھیں۔

"ہم رشتے میں بھی کزن ہوتے ہیں نسرین مگر جو کچھ سلیم نے تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد یقین کرو تمہارے سامنے کسی بھی قسم کی رشتہ داری کا ذکر کرنے سے بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔" ہاجرہ کے افسوس بھرے لہجے میں کہنے پر نسرین کیا کہتیں، چپ بیٹھی رہیں۔

"بہت بار تم سے ایک بات کرنا چاہی مگر یہ سوچ کر چپ رہ گئی کہ تم اسے میری سلیم سے رشتہ داری کے تناظر میں لوگی تو شاید بات کو سمجھ نہیں سکو گی کہ بہرحال سلیم سے میری رشتہ داری تمہاری نسبت زیادہ گہری تھی۔" وہ مزید گویا ہوئیں، بڑی بیگم ہمہ تن گوش تھیں تو ابھی ابھی ان کی بات سنتی اندر آئی صفا بھی چونکی تھی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا کہ اماں کے سامنے ہچکچا کر بات صرف ان کی بیٹیوں کی شادی کے متعلق ہی ہوتی تھی اور وہ بہنیں جب سے پچھلی بار اماں کی طبیعت بگڑنے کے بعد مشکل سے سنبھلنے میں آئی تھی، کسی بھی قسم کی ایسی بات سے بھی گریز کررہی تھیں اور کسی کو ان کے سامنے بھی نہیں آنے دے رہی تھیں سو جلدی سے سلام کرتی ہوئی اندر آئی۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو..... ماشاءاللہ ایک سی دکھتی ہو سب۔ شفا ہو یا صفا بہت پہلے دیکھا تھا تم سب کو۔" ہاجرہ نے پیار سے اس کے سلام کا جواب دے کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"صفا نام ہے میرا آنٹی اور آپ یقیناً ہاجرہ آنٹی ہیں..... حرا باجی کی امی، حیا کے اکیڈمی میں داخلے کے توسط سے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔" صفا مہذبانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں حرا کی امی ہوں اور اب تو مومن بھی وہیں پڑھاتا ہے..... خیر سے اپنے سبجیکٹ میں ایم فل کرلیا مگر نوکریوں کی صورت حال تو جانتی ہی ہو ہمارے ملک میں، سو اب سارا دھیان اکیڈمی پر ہے دونوں بہن بھائیوں کا۔" وہ ماؤں والی مخصوص فکر سے کہہ رہی تھیں۔

"جی آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔"

"آپ کیا کرتی ہیں بیٹا؟" ہاجرہ نے صفا سے پوچھا اور کافی دیر ان کی گفتگو چلتی رہی یہاں تک کہ ہاجرہ کو بڑی بیگم سے کسی اور بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا تھا صفا نے لیکن جاتے جاتے وہ صفا کو ضرور ایک پریشانی میں چھوڑ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

بار بار ایک ہی بات دماغ کی سطح سے ٹکرا کر اسے بے چین کررہی تھی۔

"سلیم بہت بیمار ہے، وہ شرمندہ ہے، تڑپ رہا ہے تم لوگوں کی صورتیں دیکھنے کو..... تم لوگ مانو یا نہ مانو باپ ہے تم لوگوں کا۔" جاتے ہوئے ہاجرہ آنٹی نے کہا تھا جب وہ ان کو گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔

صفا نے اس وقت تو اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا تھا اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہوگئی تھی مگر بستر پر لیٹتے

ہی وہ سب کچھ پوری شدت سے اسے یاد آنے لگا تھا جو ہاجرہ اسے کہہ کر گئی تھیں۔

"مجھے کیا..... بیمار تھا تو ہوتے رہتا؟ انہوں نے کون سا ہمارے ساتھ اچھا کیا جو مجھے فکر ہو ان کی۔" زیر لب بڑبڑا کر اس نے خود کو اس سوچ سے نکالنے کی کوشش کی مگر دل تھا کہ جیسے پانی بن کر بہنے کو تیار تھا۔

"کیا ہے صفا؟ نیند نہیں آرہی تو اٹھ جاؤ، مجھے مت پریشان کرو۔" حیا نیند میں بڑبڑائی تھی کہ صفا کے مسلسل کروٹیں بدلنے سے وہ ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

دفعتاً صفا نے دم سادھ لیا تھا پھر سوچتے ہوئے ذہن کی سطح پر ایک منظر ابھرا تھا۔ اس دن جب وہ گھر آئے تھے تو موڈ ٹھیک تھا ان کا وہ حسب معمول سہم کر ادھر ادھر ہونے لگی تھیں مگر صفا کو دروازے کے پاس ہی پکڑ لیا تھا انہوں نے۔

"ارے بھئی کدھر جا رہی ہو؟ ادھر تو آؤ....." وہ ہاتھ سے پکڑے پکڑے اسے وہیں چارپائی کے پاس لے آئے جہاں اماں بیٹھی کینٹین کے لیے سامان بنانے کے لیے مصالحہ تیار کر رہی تھیں۔

"یہ لو بھئی! آج تو ابا اپنی گڑیا کو ڈھیر سارے پیسے دیں گے۔" نسرین کے پاس بیٹھ کر انہوں نے جیب میں کڑکتے کئی نوٹ نکالے تھے اور ان میں سے ایک سو کا کڑکتا نوٹ نکال کر صفا کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ جو باپ کے اس التفات اور پیار کی عادی نہیں تھی، ابھی تک سہمی کھڑی تھی۔

"اپنے پیسے اپنی جیب میں واپس رکھو سلیم، ان بچوں کو نہ تو ان پیسوں کی عادت ہے جو نہ جانے کس کس کی آہیں خرید لائے ہو..... نہ ہی اس محبت کے عادی ہیں۔" نسرین آہستہ سے بولی تھیں۔

"بکواس بند کر جاہل عورت..... تجھے تو عادت ہوگئی ہے میری ہر بات کی نفی کرنے کی۔ میری اولاد کو بھی میرے خلاف کردیا ہے۔" اس نے نسرین کو جھڑک دیا تھا مگر لہجہ آج پہلے کی نسبت قدرے برا تھا اور پھر سے صفا کو اپنے قریب کیا تھا۔

"ادھر آ میری رانی بیٹیا....."

"یہ لے یہ تیرے اور یہ اپنی بہنوں کو جا کر دے دو..... شاباش جاؤ اور جوس اور آئس کریم لے آؤ۔" سلیم نے صفا کی پیشانی پر پیار کر کے سو اس کی ایک مٹھی میں دبایا اور پانچ اور نوٹ دوسری مٹھی میں دبا دیے تھے۔

صفا تھی تو بچی اتنے سارے پیسے دیکھ کر ماں سے نظر چراتی اندر بھاگ گئی تھی جہاں اس کی باقی بہنیں دروازہ کی جھری سے جھانک کر اشتیاق سے باپ کا التفات دیکھ رہی تھیں۔

"ہزار بار کہا ہے اپنی حرام کی کمائی کو اپنے تک محدود رکھا کرو، میرے بچوں کو ضرورت نہیں ہے ان پیسوں کی جو تم جیسا کوئی اور اپنی بچی کے کان کی بالیاں نوچ کے لایا ہے تو کوئی بیوی کی دن رات کی محنت اور خون پسینے کی کمائی چرا کر۔"

"دماغ خراب نہ کر خبیث عورت اور کچھ کھانے کو دے، آج میرا موڈ نہیں ہے تجھ سے لڑنے کا اور تو ہے کہ جان بوجھ کر مجھے غصہ دلانے والی باتیں کر رہی ہے، بڑی آئی حلال، حرام کی تسبیح پڑھنے والی کیا پکایا ہے آج..... ودیعہ..... دیا بیٹی کھانا لا کر دو۔" وہ بیزاری سے بولا تھا، صفا اندر جا کر خوشی خوشی سب کو بتا رہی تھی کہ ابا نے آج اس کو پیار بھی کیا اور پیسے بھی دیے، وہ سب ہی صفا کے ارد گرد جمع تھیں۔

اپنے ہی آنسوؤں پر صفا چونکی، بے اختیار ہاتھ پیشانی پر جا ٹکا تھا جہاں ابا کے پیار کا لمس آج اتنے برس بعد تازہ ہو کر اسے عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر گیا تھا۔

☆......☆......☆



"سلیم.....! تم؟" کچھ لمحے ان کو دیکھتے رہنے کے بعد ہاجرہ کے منہ سے حیرت سے نکلا تھا کہ انہیں ایک عرصہ بعد اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیرت کے جھٹکے سے کتنی دیر نکل ہی نہ پائی تھیں۔

"ہاجرہ بھائی کتنے عرصہ بعد گھر آیا ہے، اسے بیٹھنے کا نہیں کہوں گی؟" جمیل احمد نے بیگم کو نرمی سے ٹوکا جو ٹکر ٹکر سلیم احمد کو تک رہی تھیں۔

"ہاں ہاں آؤ سلیم! میں اصل میں اتنے عرصہ بعد تمہیں دیکھنے کی توقع نہیں کر رہی تھی وہ بھی رات کے اس وقت..... خیر تو ہے ناں، آپا تو ٹھیک ہیں؟" ہاجرہ نے ایک سانس میں ہی کئی سوال پوچھ ڈالے، سلیم سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"سب ٹھیک ہے آپا! آپ سے ملنے کا دل کیا تو چلا آیا کہ دل کئی دن سے عجیب سا ہو رہا تھا اور جہاں تک بات ہے رات میں آنے کی تو جرم چاہے مادی چیزوں کا ہو یا رشتوں کا آنے کے لیے رات کا ہی انتخاب کرتا ہے، کوئی سفید پوش یا شریف آدمی تو ہوں نہیں میں جو دن دیہاڑے ٹھسے سے کسی سے ملنے آسکوں۔" لہجے میں عجیب سی یاسیت بھری ہوئی تھی۔

"آپا نے بتایا تھا کہ تم بیمار رہنے لگے ہو مگر اتنے بیمار ہو یہ نہ تو تم نے کبھی بتایا نہ آپا نے کہ پرانے والا سلیم تو خواب ہی ہو گیا اب تو اس کا سایہ ہے جو میرے سامنے بیٹھا ہے..... کیا روگ لگا لیا ہے سلیم؟" ہاجرہ دکھ سے اس لٹے پٹے شخص کو دیکھ کر بولیں۔

"جسمانی روگ ہو تو بندہ بشر سہار بھی لیتا ہے، روح کو لگنے والے روگ ایسے ہی انسان کو کھا جاتے ہیں آپا گھن کی طرح۔"

"ہمت کرو سلیم احمد! کچھ نہیں ہوا ایسا کہ تم ہمت ہی ہار بیٹھے ہو..... انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جانا ہی بہت بڑی بات ہے، غلطی پر پچھتانے کی بجائے اس کو سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" جمیل احمد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"غلطیاں نہیں جمیل بھائی! گناہ کہیں..... گناہ اور میرے گناہ تو اتنے بھاری ہیں کہ جن کے بوجھ سے میں پورا کا پورا زمین میں دھنسا ہوا ہوں نہ زمین قبولتی نہ آسمان پناہ دیتا ہے..... میں وہ بدنصیب ہوں جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہرے بھرے گلشن کو خود آگ میں جھونک دیا تھا، اب دیکھیں میرے ہاتھ میں سوائے جلی ہوئی راکھ کے کچھ بھی نہیں ہے۔" سلیم احمد نے عجیب سے انداز میں کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ جمیل احمد کے سامنے کر دیے۔

"کاش کہ گزرا وقت انسان دوبارہ لانے پر قادر ہوتا؟" اس نے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"سلیم! تم سفر سے تھک کر آئے ہو، منہ ہاتھ دھو، کھانا کھاؤ اور آرام کرو..... اب آ ہی گئے ہو تو کچھ دن رہو میرے پاس..... باقی باتیں کل کریں گے۔" ہاجرہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"دیکھتا ہوں آپا! کہیں بھی تو سکون نہیں ہے..... کہیں بھی۔" وہ ایک بار پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولے۔

اسی پل کی چین انگلی میں گھماتا مومن چلا آیا، نووارد کو دیکھ کر دروازے پر ہی ٹھٹکا، تاہم سلام کر کے اندر آ کر ماں اور باپ دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے باپ کے پاس ہی بیٹھ گیا سلیم کے بالکل سامنے۔

"تمہارے سلیم انکل ہیں بلکہ سلیم ماموں میری خالہ کے بیٹے ہیں اور آج کل تمہاری بڑی خالہ شگفتہ کے پاس ہوتے ہیں میرے رضاعی بھائی بھی ہیں..... ہماری کوئی بھائی نہیں تھا تو ہمیں تو یہ اپنے بھائی ہی کی طرح عزیز ہیں۔"

"اچھا! خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... کھانا دے دیں اماں بھوک لگی ہے۔" مومن نے رسماً مسکرا کر ایک نظر ناراض اور گم صم نظر آتے شخص کو دیکھا اور پھر ماں سے مخاطب ہوا۔

"منہ ہاتھ دھولو! میں لارہی ہوں کھانا۔" ہاجرہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"اور یہ بڑی بیگم کے شوہر کے رتبے پر بھی فائز رہے ہیں۔" جمیل احمد کا انداز معنی خیز سا تھا۔ یہ سن کر مومن حقیقتاً اچھل پڑا تھا۔

"بڑ..... ی بیگم مطلب نسرین آنٹی، حیا کے فادر..... یہی مطلب ہے ناں آپ کا؟" مومن نے یقین نہ آنے والے انداز میں پوچھا۔

"ہاں وہی ہیں۔" جمیل احمد نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"حیا..... حیا کا نام لیا تم نے..... میری بیٹی کا، تم کیسے جانتے ہو اسے، کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟" سلیم نے تڑپ کر مومن سے کئی سوال کر دیے۔

"جی..... جی جانتا ہوں، میرے پاس اکیڈمی میں پڑھتی ہیں محترمہ اور تین دن سے بنا بتائے غائب بھی ہیں۔" وہ جل کر بولا۔

"اور انکل..... میرا مطلب ہے ماموں..... شکل سے تو آپ شریف اور مظلوم میرا مطلب ہے....." مومن نے کچھ یاد آنے پر آنکھیں سکیڑ کر جیسے ہی سلیم احمد سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا جمیل احمد کھنکارے تھے۔

"بیٹا باقی باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ تمہارے ماموں ابھی یہیں ہیں۔ سفر سے آئے ہیں، تھکے ہوئے ہیں۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے جاؤ اور اپنی ماں کے ساتھ کھانا لگوانے میں مدد کرواؤ۔" باپ کے ٹوکنے پر مومن اچھا خاصا بدمزہ ہو گیا تھا۔ تاہم سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سنو..... بیٹا..... وہ کیسی ہے، میری بچی حیا؟" سلیم احمد نے بیٹی کے نام پر دل کو پگھلتے محسوس کیا تھا۔

"بیٹی..... یوں سمجھیں آپ کے جیسی ہی ہے۔" کھٹ سے کہتا وہ باہر نکل گیا۔

"آپ کی طرح سڑیل، بدمزاج، تنک چڑھی....." باقی الفاظ دل ہی دل میں ادا کیے تھے اس نے کہ اس دن کے رابطے کے بعد سے وہ اکیڈمی سے غائب تھی اور مومن غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ ہاجرہ بھی اس دن بڑی بیگم کے ہاں بغیر کسی نتیجہ خیز بات کے ہی لوٹ آئی تھیں۔

☆......☆......☆

"اتنا لمبا چوڑا تعارف کرا دیا آپ نے موصوف کا مگر یہ نہیں بتایا کہ حیا کے ابا حضور ہیں محترم۔" وہ ماں کے پاس آکر شکوہ کناں انداز میں بولا۔

"میں تو پوچھنے ہی لگا تھا کہ ماموں آخر آپ نے ایسے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑے اس مظلوم خاتون پر کہ وہ تو پھولن دیوی کا لیٹسٹ ورژن بن کر سامنے آئی ہیں..... بیٹوں کی شادی کی بات پر بندے مار گراتی ہیں وہ تو ابا نے روک لیا۔" اس نے کھیرا اٹھا کر منہ میں رکھتے خاصے بدمزہ انداز میں کہا۔

"ذرا صبر نہیں باپ میں، بیٹے سے تعارف کرانے میں جلدی مچا دی، بیٹا ہے تو سوال جواب کرنے کو تیار کھڑا ہے۔" ہاجرہ ناراضی سے بولیں اور اوون سے سالن کا ڈونگا نکال کر شیلف پر رکھ دیا۔

"ہاں تو کام بھی تو ایسے ہیں اس کے..... کتنے نوجوان بڑی بیگم کی دہلیز پر سر پٹخ پٹخ کر شہید ہو گئے، کتنی ماؤں کی امپورٹڈ جوتیاں گھس گھس کر تباہ و برباد ہو گئیں اس گھر کے چکر لگا لگا کر اور بڑی بیگم کے زبانی کلامی میزائل سہنا بھی تو



آسان کام نہیں تھا مظلوم لوگوں کے لیے۔ ان ہی صاحب کی وجہ سے ناں..... اب بھی ان سے سوال جواب نہ کریں۔" ہاجرہ نے سالن والا چمچ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رسید کیا۔

"اف ظالم..... ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟" وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"برتن اٹھا کر ٹیبل تک لے چلو۔" ہاجرہ کا لہجہ سخت ہوا۔

"ویسے اماں! آپ ہیں بڑی گھنی، میرا مطلب....." ماں کے گھورنے پر وہ سہمنے کی ناکام اداکاری کرتے بولا۔

"آپ نے کبھی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ حیا کا دنیا جہان کا ظالم، جابر اور پتہ نہیں کیا کہتے ہیں ظلم کرنے والے کو..... اب مجھے ریاضی کے بندے کو کیا پتہ۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی ماں کے گھورنے پر پلیٹیں پکڑ لی تھیں۔

"ظالم انسان آپ کا کزن مطلب بھائی اب پوچھ رہے تھے میری بیٹی کیسی ہے؟ او بھائی تمہیں اب یاد آیا ہے جب پانی سر کیا آسمان سے بھی اونچا ہو چکا..... ویسے اماں ہر ظالم انسان کو اپنے ظلم مرنے سے پہلے کیوں یاد آتے ہیں؟" پلیٹیں ٹیبل پر واپس رکھ کر آنے کے بعد اس نے بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

"مومن..... چپ ہو جاؤ اللہ کے واسطے..... اس لیے تو بات نہیں کرتی تمہارے سامنے کہ اتنی مٹی پلید کرتے ہو بات کی کہ اصل بات کہیں نیچے دب جاتی ہے تمہاری فضول گوئی میں اور تم کئی نئی باتیں نکال لاتے ہو مزید۔" وہ زچ ہو کر بولیں۔

"اور خبردار جو سلیم سے کوئی غلط بات کی ہو تو..... پہلے ہی اس کی حالت دیکھی ہے پچھتاوہ اور بیماری نے کیا حال کر دیا ہے غریب کا۔" انہوں نے تاکید کی۔

"خیر..... یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مجرم قتل کرے اور اسے یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ یہ پچھتا رہا ہے اور غریب ہے۔" اس نے ماں کی بات کے جواب کی نفی کی۔

"حرا کے ابا۔" ہاجرہ زور سے پکاریں۔

"اچھا ناں..... لے جا رہا ہوں باقی برتن۔" مومن جگ لے کر بھاگا کہ جمیل احمد کے غصے سے اس کی جان جاتی تھی۔ ہاجرہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

ان دونوں کو ہی ایک سیمینار میں شرکت کے لیے اکٹھے جانا پڑا تھا۔ صفا کا اب تک احسن ورک ہی تھا۔ فیلڈ کے حوالے سے یہ اس کا پہلا تجربہ تھا سو تھوڑا سا گھبرائی ہوئی تھی مگر جیسے ہی پتہ چلا تھا کہ وہ اکیلی شریک نہیں ہوگی۔ عمر بھی اس کے ساتھ ہوگا تو اندر ہی اندر کہیں سکون سا محسوس ہوا تھا اور عمر نے واقعی بہت ساتھ دیا تھا اس کا۔ پریزینٹیشن کے حوالے سے کئی باریکیاں سمجھائی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے لوگوں کے درمیان اس کی پریزینٹیشن کامیاب رہی تھی۔ لنچ بریک کے بعد ایک گھنٹہ کی ٹریننگ تھی پھر واپسی کا طے ہوا تھا۔ وہ لوگ عمر کی گاڑی پر ہی آئے تھے۔

"ہاں تو پھر کیسا رہا آؤٹ ڈور ورک کا ایکسپیرینس؟" عمر اس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔

"بہت اچھا عمر سر لیکن آپ کی گائیڈینس نے بہت ساتھ دیا میرا..... اس کے بغیر شاید میں اتنی اچھی پرفارمنس نہ دے پاتی۔"

"ارے نہیں بھئی، بہت کمپیٹنٹ ہیں آپ، ایسے ہی بورڈ نے آپ کو نہیں سلیکٹ کیا۔ بس انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہیں خود کو۔" عمر نے کھانے کا ڈسپوزیبل ڈبہ کھول کر اس کے سامنے رکھا۔ پلیٹ چمچ اور پانی کی بوتل بھی ساتھ رکھی اور

اپنے پاس رکھا دیکھ کر بولنے لگا۔
"شکریہ۔" صفا نے شکریہ نجانے اپنی تعریف پر کیا تھا یا کھانا پیش کرنے پر جسے عمر نے مسکرا کر خوشدلی سے قبول کیا۔
"شادی کرنا چاہتا ہوں صفا آپ سے اور یہ کیوں اتنا برا لگ رہا ہے آپ کو کہ ناٹ فار لفٹ کا بورڈ ہی لگا رکھا ہے آپ نے.... دنیا میں ہر انسان کی شادی ہوتی ہے، اس پر یہ گھبرانا یا بچنا کیسا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آ رہا، یقین کریں میں آپ کے رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔"
کھانا ختم کرنے کے بعد جیسے ہی صفا نے ہاتھ صاف کر کے ٹشو پلیٹ میں رکھا تھا۔ عمر کی اچانک بات پر ساکت رہ گئی تھی۔
"آپ کا سخت لہجہ اور روڈلی بیہیویئر میرا ارادہ نہیں بدل سکتا اس لیے آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ اصل میں آپ کے اس رویے کی وجہ کیا ہے؟" اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوتے اور بولنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر عمر نے رسان سے کہا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہمارے درمیان کبھی بھی پرسنل ڈسکس نہیں ہوں گے؟" وہ ناگواری سے بولی۔
"کیوں..... آخر کیوں؟" وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور دے کر بولا۔
"میں سنجیدہ ہوں اور تمیز کے دائرے میں رہ کر آپ سے ایک جائز بات کی اجازت طلب کر رہا ہوں اور تب تک کرتا رہوں گا جب تک آپ مجھے ٹھیک طرح سے نہیں بتائیں گی کہ آپ کے انکار کی واضح اور ٹھوس وجہ کیا ہے؟" نیل کی مترنم آواز پر ان دونوں کا ارتکاز ٹوٹا تھا۔
"ٹھیک ہے عمر سر...... میں آپ کو وجہ بتا دوں گی لیکن آپ وعدہ کریں کہ اس کے بعد آپ کبھی بھی اس حوالے سے یا کسی بھی حوالے سے جو میری ذات سے ریلیٹڈ ہو کوئی بھی بات نہیں کریں گے۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے حتمی لہجے میں بولی اور پرس اٹھا کر کندھے سے لٹکایا۔
"ٹھیک ہے، اگر وہ وجہ قابل قبول ہوئی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جیسا کہہ رہی ہیں ویسا ہی ہوگا۔" وہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کانفرنس ہال میں داخل ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

"او میرے مالک! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے شاہ جہان سے ملا دیا۔" گلی کا موڑ مڑتے ہی مومن نے شاہ جہان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر جھپٹ کر گلے سے لگا لیا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی خوشی تھی کہ شاہ جہان کا سینہ خوامخواہ چوڑا ہوا۔
"پروردگارا تو نے مجھے ایسا وقت بھی دکھانا تھا زندگی میں کہ میں ان جیسے لوگوں کی تلاش میں گلی کوچوں میں خوار ہوتا پھروں...... جن کو دور سے ہی دیکھ کر کسی کونے کھدرے میں چھپ جانے کو جی چاہے تاوقتیکہ وہ اپنی منحوس صورت سمیت غائب ہو جائے۔" اسے خود سے الگ کرنے کے بعد مومن نے اپنے پچھلے بیان سے یوٹرن لیتے ہوئے کہہ کر آسمان کی طرف نگاہ کی۔ آخری فقرہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کے انداز میں کہا تھا۔
"مجھ جیسے سے مطلب؟" شاہ جہان کا انداز مشکوک ہوا۔
"تم جیسے حسین، عقل مند، ہوشیار اور باکمال لوگ۔" مومن کا انداز توصیفی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ دماغ زبان کی اس بے ایمانی پر تلملا کر رہ گیا تھا۔



"باجی کہتی ہیں کہ خوشامد کرنے والی کی بات کا کبھی یقین مت کرو وہ سب سے بڑا جھوٹا ہوتا ہے۔" اپنی تعریف پر چپکے سے مسکرانے کے بعد شاہ جہان ذرا سا اکڑ کر بولا۔
"کون سی باجی..... کیا حیا؟" مومن کے انداز میں اشتیاق در آیا تھا۔
"دیکھیے مومن بھائی! آپ بڑی بیگم کے رشتہ دار ہیں، جانتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے گھر کی خواتین کے نام یوں سرراہ لیتے رہیں۔ اس لیے محتاط رہا کریں، میں ہر بار لحاظ نہیں کروں گا۔" شاہ جہان کے آنکھیں ماتھے پر رکھ لینے پر مومن کی آنکھیں ابل پڑیں، اگلے ہی لمحے وہ شاہ جہان کو گدی سے پکڑ چکا تھا۔
"کم بخت، حرام خور، رشوت خور، ابھی تو میرے پچھلے پانچ سو ادھار ہیں تجھ پر اور تو مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔ وہ تیری بہنیں ہیں تو میری بھی بہنیں ہیں سوائے حیا کے۔"
"اچھا ناں مومن بھائی، ذرا سا مذاق نہیں برداشت کرتے ہو۔" شاہ جہان نے اپنی گردن اس سے چھڑاتے ہوئے پینترا بدلا اور مومن کے گردن چھوڑ دینے پر گردن سہلانے لگا۔
"کدھر گم تھے تم تمہاری حیا باجی؟" گلی میں ادھر ادھر دیکھ کر مومن نے پوچھا۔ گلی نسبتاً سنسان تھی۔
"گھر ہیں اور کدھر ہونا ہے۔"
"ابے گھامڑ وہ تو مجھے بھی پتہ ہے..... کھڑکی کیوں نہیں آ رہی؟" مومن نے دانت پیس کر کہا۔
"اب اس بات کا مجھے کیا پتہ..... میں کوئی دلوں کے راز تھوڑی جانتا ہوں۔" شاہ جہان کی بے نیازی دیکھنے لائق تھی۔ مومن کا دل کیا اس کی سوکھی چرخ گردن مروڑ کر رکھ دے، تاہم ضبط سے گویا ہوا۔
"اچھا سنو! جب موقع ملے مجھے اپنے نمبر سے مِس کال دینا۔ میں کال کروں گا۔ اس سے بات کرنی ہے۔" اس کے رازداری سے کہنے پر شاہ جہان کی آنکھیں باہر نکل آنے کی حد تک ابل پڑی تھیں۔
"بڑی بیگم کو پتہ چل گیا تو مجھے گولی مار دیں گی۔" وہ گھگھیا کر بولا۔
"یار..... اب ایسی بھی خونخوار نہیں ہے تمہاری بڑی بیگم، بہت ضروری بات کرنی ہے اس سے۔" مومن نے بیزاری سے کہا۔
"نہیں موبائل پر نہیں بات کرا سکتا۔ آپ بس مجھے میسج دے دو۔ وہ میں دے دوں گا لیکن پچھلے پانچ سو معاف کرنے پڑیں گے۔ پانچ سو مزید لگیں گے اس کے علاوہ موبائل میں بیلنس بھی ڈلوانا ہوگا۔" اس کے بے نیازی سے کہنے پر مومن کچھ دیر اسے کچا چبا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر جیب کنگھالتا ہوا زہر خند لہجے میں بولا۔
"سو کمینے اور بلیک میلر مل کر ایک شاہ جہان بنتا ہے۔" شاہ جہان نے اپنی تعریف مسکرا کر وصول کی تھی۔

☆......☆......☆

"اٹھو...... اٹھو فوراً اپنی سیٹ چھوڑ دو۔" عائشہ دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر آئی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر تیز تیز بولتی ہوئی ریان کے قریب آ گئی تھی۔
"کیا ہو گیا ہے عائشہ؟ دیکھ بھی رہی ہو، میں بہت ضروری کام لے کر بیٹھا ہوں۔" وہ اسکرین سے نگاہ ہٹائے بغیر مصروف سے انداز میں بولا۔
"تم اٹھ رہے ہو ریان یا میں خود ہی اس کو شٹ ڈاؤن کر دوں۔"
"عائشہ! مت کرو بھئی؟ بعض دفعہ ناں تم بالکل کسی بچی کی مانند لگتی ہو جو کسی کھلونے کو دیکھ کر مچل جائے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تب تک روئے جب تک اسے من پسند کھلونا مل نہ جائے...... بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ ڈیٹا فریز کرتا ہوا عائشہ

کی طرف متوجہ ہوا۔ لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ بھی تھی۔
"مطلب تم اپنے آپ کو کھلونا سمجھ رہے ہو؟" وہ آنکھیں پٹپٹا کر بولی۔ ریان بے اختیار مسکرا دیا۔
"قسم سے ریان، تمہیں پتہ چل جائے ناں کہ تم مسکراتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہو تو عمر بھر مسکراتے ہی رہو۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ریان جھینپ گیا۔
"کم آن ریان..... آج کل تو لڑکیاں بھی نہیں شرماتیں اپنی تعریف پر اور تم لڑکے ہو کر بلش کر رہے ہو..... کیوٹ۔" وہ شرارت سے بولی۔
"اچھا تم بتاؤ..... کس کام سے آئی تھی؟ وہ کرو اور چلتی بنو تمہارے ابا کا آفس ہے یہ لیکن میں یہاں کام کرتا ہوں اور آج مجھے بہت کام ہے، مائنڈ اٹ۔" ریان نے اس کا دھیان اپنی طرف سے ہٹایا۔
"میرے ابا کا ہے، سو میرا ہے اور میں تمہاری ہوں تو میرا آفس بھی تمہارا ہوا..... اس لیے یہ تیرا میرا کر کے میرا موڈ خراب مت کیا کرو۔ بابا آج خود آئے ہیں آفس، سو ان کی پرمشن سے ہی تمہیں لینے آئی ہوں۔ تم اور میں شاپنگ کرنے چل رہے ہیں۔" وہ اسے سمجھاتی ہوئی بولی جیسے کسی ناسمجھ بچے کو سمجھایا جاتا ہے۔
"وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا لیڈیز شاپنگ میں کیا کام بھئی؟ میں تو امی کے ساتھ بھی کبھی نہیں گیا۔"
"بہت غلط کیا اگر نہیں گئے..... اب جانا پڑے گا میرے ساتھ کہ مجھے اکیلے شاپنگ کرنا بالکل پسند نہیں۔ اب تم اٹھ رہے ہو یا میں ڈیڈ سے کہلوا کر لے آؤں۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔
"عائشہ..... بہت تنگ کرتی ہو تم بھی..... اچھا میں آج تو چل رہا ہوں لیکن تم مجھے آئندہ آفس ٹائم میں اٹھنے پر مجبور نہیں کرو گی۔" وہ اٹھتے ہوئے انگلی سے وارن کرتے ہوئے بولا۔
"ڈن....." عائشہ نے آرام سے کہا۔ ریان ضروری فائلز سمیٹنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

"مومن بھائی پوچھ رہے تھے آپ کا؟" شاہ جہاں کی بات پر حیا کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہ تین چار دن سے اس سے بالکل ہی رابطہ منقطع تھا۔
"کک..... کون مومن..... مجھ سے کچھ کہا؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔
"اپنے مومن بھائی..... کوچنگ والے؟" شاہ جہاں نے اپنی چھوٹی آنکھیں کینگنی سے گھما کر کہا۔
"آں..... اچھا..... وہ میں تین چار دن سے کوچنگ نہیں جا رہی ناں اس لیے پوچھا ہوگا۔ سر ہیں ہمارے میتھ کے، میں بھی پتہ نہیں کس کا ذکر کر رہے ہو؟ انداز بھی تو اتنا مشکوک ہوتا ہے کہ تمہارا ہر عام بات کو بھی معنی خیز بنا ڈالتے ہو فلمیں دیکھ دیکھ کے۔" حیا سوچ سمجھ کر ہی بول کر چھاور رہی تھی۔
"وہی کہہ رہا ہوں جو کہا ہے انہوں نے..... وہ تو کہہ رہے تھے کہ اپنے سیل سے بات کرا دینا حیا کی مجھ سے..... میں نے کہا نہ بابا بڑی بیگم تو میری گردن اڑا دیں گے۔ میسج دے دوں گا..... ویسے کیا کوچنگ سے غیر حاضر ہونے والی ہر لڑکی کے بارے میں ہی اتنا پریشان ہوتے ہیں وہ پھر تو قدر کرنی چاہیے ایسے استاد کی، ایسے دو چار اور استاد پیدا ہو گئے تو ہمارے ملک کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"
"بکواس بند اور آہستہ بولو، کیا میسج دیا تھا؟" حیا نے دانت پیس کر کہا اور ہاتھ میں باقاعدہ کفگیر اٹھا لی تو شاہ جہاں نے ڈرنے کی ناکام ایکٹنگ کی۔
"بکتے ہو بار سید کروں ایک؟"



"کہہ رہے تھے..... اکیڈمی آ جائیں یا کسی طرح سے رابطہ کریں فوراً۔ بہت ضروری بات کرنی ہے ورنہ وہ خود آ جائیں گے دعا باجی کے پاس شکایت لے کر آپ کی چھٹیوں کی..... نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا جان ہتھیلی پر رکھ کر پیغام رسانی بھی کرو اور کفگیر بھی کھاؤ..... واہ تیری قسمت شاہ جہاں۔" شاہ جہاں نے پیغام دے کر دکھی ہو کر آسمان کی طرف نگاہ کر کے دکھی لہجہ بنایا۔
"اچھا..... اچھا زیادہ دکھی اور مظلوم بننے کی ضرورت نہیں ہے، میرے جس میوزیکل چائے والے مگ پر تمہاری نظر تھی ناں، وہ تمہارا ہوا؟"
"اور تم ڈیو ہزاروں سال حیا باجی۔" شاہ جہاں نے تصور میں خود کو حیا کے اس خوب صورت مگ میں چائے پیتے دیکھا۔ چائے ڈالنے کے بعد کپ خالی ہونے تک دھیما دھیما سا میوزک بجاتا رہتا تھا۔ گویا جھوم ہی گیا تھا۔
"ویسے حیا باجی، مومن بھائی اچھے بندے ہیں پر ان کو بتا تو دیتا ناں آپ نے کہ بڑی بیگم رشتہ لے کر آنے والوں کی کیسے طبیعت صاف کرتی ہیں؟" شاہ جہاں کے بھولپن سے پوچھنے پر حیا نے اسے گھورا۔
"مگ ابھی میرے پاس ہے....." وہ دانت پیس کر بولی۔
"اچھا ناں....." شاہ جہاں کے تیور بدلنے پر وہ سر جھٹک کر کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

"تو آپ ہیں زرین کے بھائی تیمور۔" حیا نے سر سے پاؤں تک اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ بیچارہ اسی میں ہی ٹپٹا گیا تھا۔
"جج..... جی..... مم..... میں....."
"رکیں..... رکیں ایک منٹ....." حیا نے جلدی کے سے ٹوکا۔
"تشریف رکھیں آپ۔" تیمور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ سائیڈ میں کھڑا شاہ جہاں دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تنقیدی نظروں سے نو وارد کو دیکھ رہا۔
"آپ کو پتہ ہے ناں دنیا اتنی فاسٹ ہو گئی ہے کہ سمٹ کر ایک فنگر کلک پر آ پہنچی ہے اور آپ ہیں کہ ایک بات بھی پانچ منٹوں میں کرتے ہیں..... یہ جو مسئلہ ہے آپ کا بات کو قسط وار کرنے کا پیدائشی مسئلہ ہے یا بعد میں ہوا؟" وہ تفتیشی انداز میں بولی۔ تیمور نے سر کو مزید جھکا لیا تھا۔ وہ اچھا خاصا اونچا لمبا قبول صورت نوجوان تھا۔ عمر کوئی چوبیس یا تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ شلوار قمیص میں ملبوس تھا، اچھا خاصا معقول لگتا اگر جو چہرے کے بونق پن کو ختم کر کے ہکلے پن کو دور کر لیتا۔
"بہت..... پتا نہیں....." کچھ دیر بعد سر جھکائے جھکائے اس نے ہلکی سی آواز میں جواب دیا۔
"حیا باجی، آپ اس وقت بھول رہی ہیں کہ آپ پیشنٹ ہیں ڈاکٹر نہیں..... ان کو جس کام کے لیے بلایا ہے وہ کریں۔" شاہ جہاں بیزاری سے بولا۔
"تم سے جب مشورہ مانگا جائے تب دیا کرو اور کھڑے کس طرح سے ہو..... تمیز سے ایک طرف بیٹھو اور خبردار جو درمیان میں بولے تو....." حیا نے شاہ جہاں کو اچھا خاصا ڈانٹ کر کہا تو وہ تیمور کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا ہوا ایک سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ حیا دوبارہ سے تیمور کی طرف متوجہ ہوئی۔
"دیکھیں تیمور صاحب! زرین میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔ ہر انسان کی طرح اس کے بھی کچھ مسائل ہیں لیکن جہاں تک میں سمجھی ہوں ان مسائل کی وجہ آپ ہیں۔" اس کے اطمینان سے کہنے پر تیمور

نے جھٹکے سے سر اٹھا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا مگر پھر فوراً ہی پرانی حالت پر چلا گیا تھا۔

"کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں؟" اس کے جھکے سر کو دیکھ کر حیا نے پوچھا۔

"وہ آپ خود کہتی ہیں کہ میں قسط وار بول کر آپ کا وقت ضائع کرتا ہوں۔" اس نے بیچارگی سے کہا۔

"ہاں بھئی یہ تو ہے لیکن اس چیز کو ختم کرو۔ اختیار میں ہے تمہارے، ایسے تو لوگ تم جیسے لوگوں کی مدد کرنا تو دور کی بات، روند کر گزر جاتے ہیں لیکن اس بات پر میں بعد میں بحث کروں گی۔ ابھی آتے ہیں زرین کے مسئلے پر بلکہ آپ کا بھی مسئلہ ہوا گھر آپ کے والد کا، دکان آپ کے والد کیا اور اجارہ داری تائی کی مجھے تو خاص غصہ ہی ایک ہو رہی یہ بات، میرا بس چلتا تو ابھی کے ابھی دو منٹ میں اس خاتون کے مزاج درست کر دیتی لیکن......" وہ اپنے مخصوص رنگ میں آ گئی تھی۔

"خیر میں وہ تائی بیگم ہیں حیا باجی، جس کا پیچھا لے لیں، قبر تک جان نہیں چھوڑتیں۔" شاہ جہان بڑبڑایا تھا۔

"لیکن اپنے حق کے لیے انسان کو خود لڑنا ہوتا ہے۔ مجھے تو وہ خاتون ایک سیکنڈ میں کہہ دیں گی کہ تم کون ہو جی؟ میری بولتی تو وہیں بند ہو جاتی ہے۔ تو جب آپ کا حق غصب کیا جا رہا ہو وہاں ڈٹ جاؤ، لڑ جاؤ، مر جاؤ لیکن اپنا حق لے کر رہو۔ میں مکان اور مکان پر تو بعد میں آتی ہوں۔ ابھی تو انسان کے بنیادی حق کی بات ہو رہی ہے۔ اللہ کا غضب، سارے گھر کے کام کرتی ہے زرین اور غالباً باہر کے کام آپ کے ذمہ ہیں پھر بھی وہ خاتون ایک سوکھی روٹی بھی دینے کی روادار نہیں ہے تم دونوں کو۔" حیا کی تو غصے سے ماتھے کی رگیں پھول گئی تھیں مگر وہ ایک دم چپ ہو کر ساکت ہوئی تھی جب اس نے اونچے لمبے اس مرد کو روتے دیکھا تھا اور تو اور شاہ جہان کی آنکھیں بھی یہ منظر دیکھ کر پھٹنے کے قریب ہو گئیں جبکہ حیا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسی صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے...... وہ پریشان ہو یا حیران؟

☆......☆......☆

"اور سنائیں ڈاکٹر دعا، سکندر صاحب کیسے ہیں؟" وہ دونوں وارڈ سے باہر آ رہے تھے جب حیدر نے ایک دم ہی دعا سے سوال کیا۔

"کون سکندر......؟" دعا جواب دے کر سوچنے لگی کہ ایسا کون سا مریض ہے جس کی بابت ڈاکٹر حیدر دریافت کر رہے ہیں جبکہ اس کی بات اور ریسپانس دیکھ کر ڈاکٹر حیدر ذہن میں الجھن لیے وہیں رک گیا اور وہ بھی رکی کہ اگلے وارڈ میں دونوں نے ساتھ ہی جانا تھا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر حیدر، آپ رک کیوں گئے، خیریت؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر دعا، سکندر آپ کے ہونے والے ہاف بیٹر ہیں...... آپ نے خود ہی ان کا نام بتایا تھا اور زندگی کے ساتھی کا نام ہر وقت زبان پر نہ بھی ہو تو دل و دماغ کی سلیٹ پر کندہ ہوتا ہے۔" اس کے طنز سے کہنے پر دعا کے چودہ طبق ہی روشن ہو گئے تھے۔ اسے بھول چکا تھا کہ ڈاکٹر حیدر کی کسی بھی پیش رفت کو روکنے کے لیے اس نے ایک فرضی منگیتر کا ڈرامہ رچایا تھا اور اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی کہ اسٹاف کو اس حوالے سے ٹریٹ دینے کے بعد ڈاکٹر حیدر اس سے تو کوئی بات کیا ہی کرتا، بالکل چپ ہی ہو گیا تھا۔ دعا کو پہلے پہلے تھوڑا سا افسوس ضرور ہوا تھا خوامخواہ کا جھوٹ گھڑنے پر مگر پھر اماں کی حالت اور کسی بھی رشتہ لے آنے والوں کی درگت کا سوچ کر اس نے خود کو مطمئن ضرور کر لیا تھا۔ فاریہ اور دیگر اسٹاف ممبران کبھی کبھی اس حوالے سے مذاق ضرور کر لیتے تھے۔ وہ محض مسکرا دیا کرتی تھی اور یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ خاصی کم گو تھی۔ تاہم ڈاکٹرز کے اس کے منگیتر کے تصویر دیکھنے کے اعتراض پر اس کا



جواب یہی ہوتا تھا کہ وہ بالکل بھی سوشل نہیں ہیں اور تصویریں وغیرہ بنانے کے بھی شوقین نہیں ہیں ان فیکٹ ان کے پاس ٹائم ہی نہیں ان فارملیٹیز کے لیے ہاں وہ جب پاکستان آئیں گے وہ بالمشافہ ملوائے گی سب کو ان سے اس بات کو ڈیڑھ دو مہینے ہونے کو آئے تھے اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ یہ ساری کہانی سناتے ہوئے اس نے اس فرضی کردار کا نام ہی نہیں سوچا تھا، نہ ہی کسی نے پوچھا تھا تمہارا فیانسی تمہارا ہاف بیٹر، تمہارے وہ کہہ کر بات کرتیں سب اور پھر ہنسی مذاق میں بات ختم ہو جاتی تھی۔ ایک بار ڈاکٹر شجاع کے نام پوچھنے پر اس نے سکندر بتا دیا تھا۔ جو اسے تو بھول گیا تھا ڈاکٹر حیدر کو یاد رہ گیا تھا۔

"یا مجھ سے بچنے کے لیے یہ سکندر نامی بندہ خود دریافت کر لیا آپ کے ذہن نے؟" لیب کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا وہ اس کے قریب آیا۔ اس کی بات پر دعا ایک دم بھک سے اڑی جیسے مگر لمحوں میں ہی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"کیوں آپ کوئی عفریت ہیں یا کوئی بدروح جس سے میں ڈرتی ہوں اور آئندہ ایسی کوئی بھی بات مت سوچیے گا۔" انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتی وہ وہاں سے چلی گئی۔ وہ نادانستگی میں اسے ایک بار پھر ناراض کر چکا تھا۔ طویل سانس لے کر وہ بھی وارڈ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

چار دن کے بعد وہ سامنے تھی تو دل تو کر رہا تھا کہ سارے کام کاج چھوڑ کر وہ اسے دیکھتا ہی رہے مگر اکیڈمی میں اپنی پوزیشن اور اس کی عزت کا خیال ہمیشہ غالب رہتا تھا سو چالیس منٹ کے پریڈ کے بعد اس نے باقی کلاس کو ان کی ٹیسٹ پکڑاتے ہوئے سر جھکائے بیٹھی حیا کو پکارا۔

"جی تو حیا بی بی! یہ تو ایک مہینہ میں تین سے چار چھٹیوں کی عادت بنائی ہے آپ نے ...... اس سے آپ کی پرسنٹیج پر تو جو اثر پڑ رہا ہے سو پڑ رہا ہے، سبجیکٹ بھی لڑ کھنے کے چانسز بڑھ رہے ہیں، آپ کی منتھلی رپورٹ گھر بھیجنے پر آپ کی سسٹرز بھی سخت ناراض تھیں ہم سے آپ کی ایسی روٹین پر آپ کو نیکسٹ ٹائم آؤٹ کر دیا جائے گا۔" اتنے دن غائب رہنے کا اس نے خوب بدلہ لیا تھا حیا سے۔

"سوری سر...... نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔" وہ بیگ کے زپ کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے بولی۔

"گڈ...... سٹ ڈاؤن۔" اسی سنجیدہ انداز میں کہتا وہ کلاس سے باہر چلا گیا کہ میم حرا کیمسٹری کے پیریڈ کے لیے باہر آ چکی تھیں۔ چھٹی کے وقت وہ اسے باہر گیٹ کے پاس بائیک اسٹارٹ کرتا ملا۔

"سیل آن رکھنا اپنا آج، بہت ضروری بات کرنی ہے۔" شاہ جہان کو سامنے سے آتے دیکھ کر مومن نے کہا اور بائیک اڑا کر لے گیا۔ تاہم حیا کو اس کے موڈ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس سے سخت ناراض تھا۔

"چلے گئے وہ اب؟" شاہ جہان کے چٹکی بجانے پر وہ چونکی مگر خلاف معمول کچھ بھی کہے بغیر اس کے پیچھے خاموشی سے چل دی۔

"کیا ہو گیا؟ لگتا ہے آج زیادہ ہی طبیعت صاف کر دی ٹیچرز نے، میں تو کہتا ہوں یا پڑھائی میں پوری طرح سے دل لگا لیں یا پھر پڑھائی کو دل سے اور زندگی سے نکال دیں...... نالائقی کا زمانہ گزارا ہے میں نے کچھ دن، تو یہ کیا کتنی لعنت ملامت برستی ہے ہر طرف سے، نہ استاد چین لینے دیتے ہیں نہ زمانہ اور نہ ہی کم بخت دوست...... آپ خود کو ہی دیکھ لیں، گھر میں باجیاں اور یہاں......"

"چپ کر جاؤ شاہ جہان، یہ نہ ہو یہ بھاری بیگ تمہارے سر پر مار دوں۔" حیا کے دانت پیس کر کہنے پر شاہ جہان

منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

"تشریف رکھیے..... مجھے بات نہیں کرنی ہے۔" وہ جیسے ہی فائل کے صفحے الٹ پلٹ رہا تھا صفا کی بات پر چونکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے سنجیدگی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ واپس آیا فائل ٹیبل پر رکھ کر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جی صفا.... بولیے کیا بات ہے؟" عمر نے نرمی سے کہا کہ وہ اسے روک تو بیٹھی تھی مگر اب سے بے چین نظر آرہی تھی۔

"یہی بات میں آپ سے کہنا چاہتی تھی کہ کہیے کیا پوچھنا ہے آپ کو؟" طویل سانس لے کر اس نے کہا۔ عمر کے لیے وہ بے حد خوشی کا لمحہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ خود اپنی ذات کے اسرار کھولنے پر آمادہ تھی مگر وہ خود بھی اس پل الجھن میں پڑ گیا کہ صفا کے تاثرات بے حد سنجیدہ تھے۔ جیسے آر یا پار والا معاملہ ہو، جیسے وہ آج ایسا کچھ بتائے گی کہ اس کے بعد اس کے پاس کہنے کے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ وہ ہلکا سا کھنکارا پھر سوچ سوچ کر بولنے لگا۔

"دیکھیے صفا.... انسان کو پرکھنے کے لیے بعض دفعہ لمحات ہی کافی ہوتے ہیں اور ہم لوگوں کو اکٹھے کام کرتے ہوئے کچھ عرصہ تو ہو گیا ہے، میں نے جب آپ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا تو ایک الگ سے احساس نے آپ کے لیے میرے دل میں جگہ بنائی تھی۔" اس کی بات سنے صفا نے بے ساختہ نظریں جھکا کر اپنے بیگ کے اسٹریپ سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

"میں اسے وقتی پسندیدگی سمجھا تھا کہ ہم زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت سی باتوں کی وجہ سے متاثر ہو جاتے ہیں۔" عمر پیپر ویٹ پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔

"مگر وقت گزرنے کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ آپ ہی وہ لڑکی ہیں جسے میری زندگی کا ساتھی بننا چاہیے۔" صفا نے بے اختیار پہلو بدلا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری باتیں شاید اچھی نہیں لگ رہیں لیکن معاملات کلیئر کرنے کے لیے باتوں کو بھی کلیئر کر دینا چاہیے۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔

"میں یہ نہیں جانتا کہ یہ محبت ہے، پسندیدگی ہے یا کون سا جذبہ ہے کہ میں جب آپ کے انکار کا تصور کرتا ہوں مجھے گھٹن ہونے لگتی ہے، میں آپ کے بغیر زندگی گزارنے کا سوچوں تو سانسیں رک جانے کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم دونوں میچور ہیں، پروفیشنل لائف کا ایک پیریڈ گزار رہے ہیں، دن رات کیلکولیشنز سے واسطہ ہے ہمارا لیکن انسان کے کچھ جذبات ان باتوں سے ماورا ہوتے ہیں شاید....." اس نے ایک پل کو صفا کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا، وہ لب بھینچے ہوئے تھی۔

"میرے آپ کے حوالے سے جو بھی جذبات ہیں وہ ان زمینی حقائق کو ماننے سے انکاری ہیں..... آپ کے پاس کوئی ایسا حل ہے تو بتایئے جس سے یا تو مجھے میری منزل مقصود مل جائے یا آپ کے انکار کی وجہ جان کر بھی میں سکون سے رہ پاؤں بتایئے.....؟" وہ عجیب بے بسی کی کیفیت میں کہہ رہا تھا۔ صفا کچھ لمحے میز کی سطح پر ہی نظر گاڑے رہی پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"عمر سر....." عمر کا رواں رواں گویا سماعت میں ڈھل گیا تھا۔

"ہماری زندگی کا دارومدار ہماری ماں پر ہے..... وہ ہم بہنوں کے نظام شمسی کا سورج ہیں جن کے گرد ہم پانچوں



اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔" وہ میز کی سطح کو انگلی کے ناخن سے کھرچتے ہوئے بولی۔

"ہماری اماں کی زندگی کی کتاب کے روشن ابواب صرف ہم چھ بہنوں پر مشتمل ہیں، باقی کی کتاب میں آغاز سے اختتام تک تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں، کتابوں کو لوگ پڑھتے ہیں، ہم نے اپنی ماں کی زندگی کی کتاب کو تو ان کے ساتھ جیا ہے اور وہ جینا..." اس کی آواز میں ہلکی سی نمی در آئی تھی۔ عمر بے چین ہوا۔

"مجھے لگتا ہے اس زندگی کے لیے لفظ "جینا" کا استعمال نہیں ہونا چاہیے جس میں نسرین نامی عورت چھ بچیوں کے ہمراہ زندگی برتنے کو نکلی تو دنیا تو کیا ہی اس کو کچھ دیتی سلیم نامی شخص کی کافی تھا اس کا خراج لینے کو چھ بچیوں کے پیٹ کا دوزخ، روٹی، کپڑا، چھت، تعلیم، ہر بنیادی ضرورت کو پورا کرتے کرتے وہ ہانپ جاتی جب سلیم کے جوئے اور نشے کے لیے بھی اسے اپنی ہڈیوں کو گھسانا پڑتا تھا۔ اس زندگی کے پنے کھولنے کے لیے بہت ہمت، حوصلہ اور جگر چاہیے عمر سر جو ہم نے تب ہی بند کر دی تھی جب اس کی خونی یاد سے میری ماں دماغی مریضہ بن گئی تھیں اس کتاب کا ایک باب کتاب سے نکل کر ہمارے سینوں میں کسی خنجر کی مانند گڑا ہے۔ جسے ہم باوجود کوشش کے بند نہیں کر سکتے، میری بہن ودیعہ....." ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک ہی گیا تھا۔ جسے صفا نے سرعت سے انگلی کی پور پر سمیٹ لیا تھا۔

"کس کے نام پر ہے وہ باب...." وہ کچھ وقفے سے بولی۔

"مختصر یہ کہ ودیعہ کی جوان مرگ کے بعد پہلا رشتہ دعا کے لیے آیا تھا جب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اماں نے ان لوگوں کا مدعا سن کر چیخنا چلانا اور برتن پھینکنا شروع کر دیے اور نتیجہ ان کی بے ہوشی اور ایک طویل دورے پر منتج ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے ساتھ طویل سیشنز اور دوائیوں کے بعد وہ بہت حد تک سنبھل گئیں مگر ودیعہ کی موت نے ان کو اتنا کمزور کر دیا اعصابی طور پر کہ دل کسی بھی غیر معمولی بات کو برداشت کرنے کی کنڈیشن میں نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا کا ہر مرد یا تو سلیم کا روپ لیے پھر رہا ہے یا پھر ہر شادی شدہ بچی کا ودیعہ جیسا انجام ہوتا ہے.... ڈاکٹرز سمیت ہم میں سے کوئی اس خیال کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو ان کی شدید ترین طبیعت کی خرابی کی صورت میں نتیجہ بھگتتا ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے ہمارے گھر میں اماں سکون سے ہیں کہ ہم سب ان سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ہمارے لیے ہماری ماں ہی ہر رشتہ ہیں۔ ہمیں کسی بھی نئے رشتے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لل..... لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے صفا آپ لوگوں کو ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شادی ایک مذہبی فریضہ ہے اس سے روگردانی ممکن نہیں، محض ایک بیمار انسان کی بیمار سوچ کے لیے..... معافی چاہتا ہوں مگر سچ یہی ہے۔ وہ آپ کی والدہ ہیں، بہت مشکل زندگی دیکھی ہے انہوں نے، ایک غلط سوچ کو انہوں نے زادِ راہ بنا لیا آپ بہنوں کو ل کر دعا کی شادی کر دینی چاہیے تھی اس کی نارمل اور خوشیوں بھری لائف سے آپ کی والدہ کا وہ غلط تصور غلط ثابت ہو جاتا کہ ہر مرد سلیم ہوتا ہے یا ہر بیٹی کا ودیعہ جیسا انجام ہوتا ہے۔" عمر جذباتی ہو کر بولا۔

"آپ کے خیال میں نہیں کیا ہوگا..... سب کچھ کر کے دیکھا مگر جب بات ہماری ماں کی زندگی ختم کرنے تک آئی۔ ہم نے ہر اس خیال اور کوشش کو ترک کر دیا جو ذرا سا بھی ہماری ماں کو پریشان کرے۔" وہ پھیکا سا مسکرا کر بولی۔

"معاف کیجیے گا صفا، آپ سب یہ سمجھتی ہیں کہ ایسا کچھ کرنے سے خدانخواستہ آپ کی ماں کی جان بچ سکتی ہے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ جب کسی کا وقت آتا ہے تو اسے کسی حیلے بہانے کی ضرورت پڑتی ہے اور اب اگر وہ سلامت ہیں تو آپ سب کے ایک فضول اور غیر منطقی فیصلہ لینے کی وجہ سے ہیں؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں عمر سر..... لیکن یہ سب باتیں آپ، ہم سب سمجھ سکتے ہیں، اماں نہیں سمجھ سکتیں سمجھنا تو دور کی بات وہ سنتے ہی دورے کی کیفیت میں چلی جاتی ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم بھی شادی کرنی چاہیے

اور یقین کریں کہ اب اگر کوئی ہمارے اس فیصلے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں، یہ ہے ساری کہانی...... آپ بہت اچھے ہیں، یقیناً ایک اچھی لڑکی ڈیزرو کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنی زندگی کا رخ ابھی سے موڑ لیں گے اور آئندہ اس حوالے سے مجھ سے بات نہیں کریں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"صفا...... اگر...... اگر میں انتظار کروں؟" عمر کے اچانک کہنے پر صفا حیران ہوئی۔

"کس برتے پر عمر سر؟ جب میں نے آپ کو امید کا کوئی سرا پکڑایا ہی نہیں...... جس چیز کا ہونا ہی ناممکن ہے اس کے ممکن ہونے کا تصور کرنا بے وقوفی ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"ہو سکتا ہے...... ہو سکتا ہے کہ جس زندگی کی تلخیوں نے آپ کی والدہ کو ایک غلط خیال کے جال میں پھانس دیا ہے اسی زندگی کا کوئی روشن رنگ اس جال کو کاٹ ڈالے، مجھے اس انتظار سے مت روکیں صفا میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"عمر سر...... آپ صرف میرے گلٹ میں اضافہ کریں گے کہ ایک شخص اپنی زندگی کو میری وجہ سے سپوئل کر رہا ہے، میں ہرگز ایسا نہیں چاہوں گی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"اچھا تب تک جب تک آپ جیسی کوئی مجھ سے ٹکرا نہیں جاتی......" اس کے انداز میں اصرار تھا یا انتظار، بے بسی تھی یا التجا جس نے صفا کو ایک دم چپ کرا دیا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

"ابا...... میرے ابا......" حیرت سے اس کی آواز ایک دم اونچی ہوئی تھی۔ جس کا احساس ہوتے ہی اس نے فوراً ہی منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا پھر جا کر کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر آئی تھی کہ دعا ابھی ڈیوٹی سے لوٹی نہیں تھی۔ حیا ابھی تک پارلر میں تھی۔ جبکہ صفا اور شفا اماں کے ساتھ لاؤنج میں تھیں۔ اسے وہ بات جاننے کی جلدی تھی جس کے بارے میں آتے آتے مومن نے تاکید کی تھی کہ سیل لازمی آن کرنا...... ورنہ اس نے ایسے کسی وقت میں کبھی سیل آن نہیں کیا تھا۔ اب دوسری طرف سے مومن نے جو بات بتائی تھی اس نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"ہاں بھئی تمہارے ابا...... میری اماں کے بھولے بسرے خالہ زاد ہیں، آج کل ہماری طرف آئے ہوئے ہیں اور تم بہنوں کی یاد میں تڑپ رہے ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا جبکہ اس کی بات نے حیا کی سانسیں روک دی تھیں گویا۔

"اماں ان کی ناز برداریوں میں لگی ہوئی ہیں کہ ان کی طبیعت اور حالت ٹھیک نہیں ہے اور مجھے ان سے اکیلے ملنے کا موقع نہیں مل رہا ورنہ بڑا حساب کتاب کرنے کا ارادہ ہے میرا ان سے کہ نہ وہ ایسے ظلم کرتے نہ تمہاری ماں بیمار ہو کر انوکھا فیصلہ کر کے ظالم سماج بنتیں تمہاری اور میری راہ میں...... مگر ان سے اکیلے ملاقات کو میری اماں ناکام بنا رہی ہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"کیا ہوا ہے ان کو؟" حیا کی آواز بھرائی۔

"کھانسی سے تو لگتا ہے کوئی لنگز پرابلم ہے ان کا سوئیر قسم کا، اس کے علاوہ بھی کئی مسائل ہیں مگر مجھے تو پچھتاوا لگتا ہے عمر بھر کی کرنیوں پر کہ سارا دن میری اماں سے تم لوگوں کا یا تو ذکر کرتے نظر آتے ہیں یا روتے ہوئے۔"

"حیا باجی...... بڑی بیگم بلا رہی ہیں۔" شاہ جہان کی آواز پر وہ چونکی جو دروازہ بجا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے سیل آف کر کے اپنے بیگ میں رکھا اور بیگ اٹھا کر الماری میں اپنی مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔ دروازے کا لاک کھولتے اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرے کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے دروازے کا



لاک کھولا تھا۔

☆......☆......☆

"اماں...... !" کچھ یاد آنے پر حیا جو لیٹ کر کتاب پڑھ رہی تھی اگرچہ دھیان کی اڑان کہیں اور تھی نے کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھی اور اٹھ بیٹھی۔

"جی بیٹے۔" بڑی بیگم قمیص کی ترپائی میں مگن بولیں جبکہ شفا بھی وہیں نزدیک نیچے کارپٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی مختلف اخبارات میں جابز کے ایڈز پر نشان لگا رہی تھی، دعا کی ڈیوٹی تھی۔ صفا نے آج لیٹ آنے کا کہا تھا کہ اس لیے کہ آخری دن ہونے کے باعث کلوزنگ چل رہی تھی، حیا تھکی آئی تھی سو وہ کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔

"ابا کا رشتہ آپ سے کیسے ہوا تھا؟" سر گھٹنوں پر دونوں کہنیاں ٹکا کر چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر اشتیاق سے پوچھا۔

"فار گاڈ سیک حیا...... میں نے تمہارے ذمہ ایک ٹاپک لگایا ہے یاد کرنے کے لیے اور تم سلیم احمد کو لے کر بیٹھ گئی ہو؟" شفا کا انداز تنبیہی ہوا۔

"ہو گیا ہے یاد، میرا دل کر رہا ہے اماں، ابا کے رشتہ کی ہسٹری جاننے کو...... ابھی تھوڑی دیر میں ٹیسٹ دے دوں گی آپ کو۔ بتائیں ناں اماں...... اس سے پہلے کہ آپ کی دوسری افلاطون بیٹیاں آ جائیں۔" وہ بیزاری سے شفا کو جواب دے کر دوبارہ بڑی بیگم کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیسے مطلب بیٹے؟ جیسے سب کے رشتے آتے ہیں، ویسے ہی ان کا رشتہ آیا تھا۔" بڑی بیگم نے دانتوں سے دھاگا توڑ کر ترپائی کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ شفا ناگواری سے سر جھٹک کر دوبارہ اخبارات کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"نہیں ناں اماں! ٹھیک طرح سے بتائیں، مجھے پورا قصہ سننا ہے۔" حیا اصرار کر کے بولی۔

"بھئی سارا قصہ یہ ہے کہ سلیم احمد کی منگنی کسی چچا زاد، خالہ زاد سے پہلے ہوئی تھی جب انہوں نے مجھے کسی خاندان کی شادی میں دیکھا اور بضد ہو گئے کہ شادی کروں گا تو یہیں...... ہم بھی دوسرے کے رشتے دار ہی تھے ان کے کچھ مسئلے مسائل بھی ہوئے، رکاوٹیں بھی آئیں مگر قسمت میں لکھا تھا سو شادی ہو گئی۔" بڑی بیگم اب قمیص کی دوسری سائیڈ کی ترپائی کرتے ہوئے ایسے بتا رہی تھیں، جیسے اپنی بہن کی کہانی سنا رہی ہوں جبکہ شفا کچھ بڑبڑاتے ہوئے اخبارات پر ہی جھکی ہوئی تھی۔ تاثرات بتا رہے تھے کہ سلیم احمد کا ذکر اسے ہرگز پسند نہیں آ رہا۔

"واؤ اماں...... امیزنگ، یہ تو کسی رومینٹک موی کا سین لگ رہا ہے پھر اماں......؟" حیا کا اشتیاق بڑھا۔

"پھر کیا ہونا تھا بچے، جب کسی کا وقت اچھا ہو تو دوست بھی موسمی کیڑوں کی طرح یہاں وہاں سے نکل کر اس کے قریب جمع ہو جاتے ہیں، انہی میں سے کسی نے بڑی بڑی عادات ڈالیں سلیم کو یا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پرانی منگیتر نے بھی تعویذ گنڈے کر کے سلیم احمد کو برباد کر دیا تھا۔" بڑی بیگم سامنے سے کسی نادیدہ چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

"مگر میں دوسری بات کا یقین کم ہی کرتی ہوں۔ ہر چیز کاتب تقدیر میں درج کر دی گئی ہے ازل سے...... بس سلیم کبھی کون بن جاتا ہے تو کبھی کون، سلیم احمد ہی میں میں نے دنیا کا بہترین شوہر، بہترین بیٹا اور بہترین باپ پایا اور وقت بھی کیسی چیز ہے کہ جب اپنا رخ بدلے تو ایک بہترین بندے کی بھی بدتر صورت دکھا دیتا ہے، ہمیں ان پانچ سالوں پر پھر سلیم احمد کے بدترین رویے پر مشتمل پندرہ سال حاوی ہو گئے تھے...... بس یہ تھی ساری کہانی۔" انہوں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اماں... میرا بس چلے ناں میں ابا کے ان دوستوں کو گولی مار دوں جنہوں نے ابا کو بری عادتوں میں ڈال کر ہم سے ہمارے باپ کی شفقت چھین لی تھی۔" حیا اچھی خاصی جذباتی ہو کر بولی۔
"جو چیز ہونی ناممکن ہے اس پر محبت کرنا اور اس کی خواہش کرنا اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔ سلیم احمد میں تمہارا انٹرسٹ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اتنا ٹائم تم کیمسٹری کو دے کر اپنی گریڈنگ اپ گریڈ کر سکتی تھی کل کے ہونے والے ٹیسٹ کی۔"
"اماں... یہ ساری بھی تو اپنے پرسنلز ڈسکس کرتی ہیں آپ سے، میں نے کبھی دخل اندازی کی؟ نہیں ناں... میں کیا کروں کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہمارے ساتھ، اماں کے ساتھ یا دیا کے ساتھ اس کے باوجود میرا دل کرتا ہے کہ میں ان کے بارے میں بات کروں، ان اسباب کو معلوم کروں جن کے باعث انہوں نے ایک خوب صورت آئیڈیل زندگی کو اپنے ہاتھوں تباہ کر دیا۔" اس کے آنسو نکل آئے تھے اور چند ہی لمحوں میں وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ بڑی بیگم تو ساکت رہ گئیں حیا کے اس ردعمل پر جبکہ شفا نے جلدی سے اخبارات کو چھوڑا اور آ کر حیا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔
"کم آن حیا... اس لیے تو ہم سب تمہیں اس ٹاپک پر بات کرنے سے منع کرتے ہیں کہ سلیم احمد کا ذکر اس آگ کی طرح ہے جو اس وقت تو جل کر اپنے اردگرد کی ہر چیز کو بھسم کر ہی ڈالتی ہے۔ بعد میں بھی اس کی جلن تو اذیت ناک ہوتی ہی ہے، اس جلنے کے زخم کو مندمل ہونے میں بھی بہت وقت لگتا ہے... ابھی دیکھو! تم بھی رو رہی ہو، اماں بھی اور میں بھی پریشان ہو گئی ہوں تم دونوں کو دیکھ کر۔" شفا اس کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"بات کرنے سے تو رک جاؤں شفا آپی، اپنے دل و دماغ سے کیسے نکالوں یہ بات جو اس وقت میرے اندر کے احساس محرومی کو بڑھا دیتی ہے جب اکیڈمی میں، کالج میں لڑکیاں اپنے فادر کا، ان کی محبت کا ذکر کرتی ہیں۔" وہ سوں سوں کرتے ہوئے بولی۔
"حیا... اماں پریشان ہو رہی ہیں۔" شفا، حیا کے کان میں بولی۔ حیا نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے اور قریب کھسک کر اماں کی گود کو سر رکھ دیا۔
"اماں! آپ دنیا کی بہترین ماں ہیں... ہمیں آپ پر فخر ہے، مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں لیکن دنیا کی بھیڑ میں کبھی مجھے سلیم احمد مل گئے تو میں ان کو اپنے سوالات کے جوابات لیے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔" وہ آنکھیں موندے موندے بولی۔
"میں نے تم لوگوں کو کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی لیکن باپ کی شفقت دینا میرے بس میں نہیں تھا میرے بچے۔" وہ اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے افسردگی سے بولی تھیں۔

☆......☆......☆

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں بھائی جان؟" سلیم احمد کی آواز خوشی کے مارے کپکپائی۔
"ہاں یار... وہ ہماری بھی بچی ہے اور ہمارے مومن کی پسند بھی... اگر ہماری بہو بن کر آئے گی تو اس سے بڑی خوشی کی بات ہی کوئی اور نہیں ہمارے لیے مگر سارے حالات تمہارے سامنے ہی ہیں۔" جمیل احمد کی مایوسی پر سلیم کا چہرہ بھی بجھ گیا تھا۔
"آج آپ کس خوشی میں بڑی بیگم کی گلی کے چکر لگاتے رہے؟ آپ کے ماضی میں کہ آپ کو دیکھ کر آپ کی بیوی



اور بیٹیاں ہار پھول لے کر دوڑی چلی آئیں گی اور پھر حیا کی اکیڈمی چھڑوا دی جائے گی اور کوئی بعید نہیں کہ وہ یہ محلہ ہی چھوڑ کر چلے جائیں۔" مومن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
"مومن... کیسے بات کر رہے ہو تم سلیم سے، ماموں ہیں تمہارے۔" ہاجرہ نے گھرکا۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے بچہ، مت ٹوکو اسے۔" سلیم احمد ہارے ہوئے جواری کی طرح بولے۔
"بے فکر ہو جاؤ بچے، میں آئندہ باہر نہیں نکلوں گا۔ بس بچیوں کو دیکھنے کی ہڑک اتنی شدید تھی کہ بنا سوچے سمجھے نکل کھڑا ہوا۔ ہاں احتیاط کا دامن ہاتھ سے پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ماسک لگایا تھا میں نے۔" وہ مزید بولے۔
"تم ماسک نہ بھی لگاتے سلیم تب بھی وہ تمہاری اولاد ہے۔ دنیا کا کوئی قانون تمہیں ان سے ملنے اور دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔" ہاجرہ تنک کر بولیں۔
"جی... جی ضرور، بہت اچھی فصل کے بیج بو کر گئے تھے ناں جس کو بڑے فخر سے کاٹنے چل پڑے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے سنا ہے کہ ان کی بیٹیاں ان کی شکل دیکھنا تو ایک طرف ان کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتیں۔"
"حرا کے ابا... آپ اس کو روک نہیں رہے... کتنی بدتمیزی کر رہا ہے یہ سلیم سے۔" ہاجرہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔
"مومن! سلیم کا جو بھی معاملہ ہے اس کے خاندان کے ساتھ ہے۔ تم آئندہ اس معاملے میں کچھ نہیں بولو گے، اب تم جاؤ یہاں سے۔" جمیل احمد مومن کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولے تو وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا تھا۔
"یار... بچہ ہے، نادانی میں کچھ کہہ جائے تو ناراض مت ہونا۔"
"ارے بھائی صاحب، بچوں سے کیسی ناراضی اور کچھ بھی تو غلط نہیں کہا اس نے۔" وہ افسردگی سے مسکرائے۔
"اچھا سلیم... تم تو مجھے کسی دوست سے ملنے کا کہہ کر نکلے تھے پھر گئے وہاں یا نسرین کے گھر کی گلی ہی ناپتے رہے۔"
"نہیں آپا! اس گلی کی طرف ہی گیا تھا جہاں اب میرے دھیان کی پرواز ہر وقت رہتی ہے۔ آپ کو بتاتا تو شاید روک دیتیں مگر تین گھنٹے ٹہلتے رہنے کے باوجود بھی وہ دروازہ ویسے بند رہا جیسے قدرت مجھ پر ہر خوشی کا دروازہ عرصہ ہوا بند کر چکی ہے۔" وہ سر جھکائے بولے۔
"ہم..." ہاجرہ کا ہم معنی خیز تھا۔
"ایسا کرو آج تم میرے ساتھ ایک جگہ چل رہے ہو۔ تمہارا ایک گوہر مقصود تو تمہیں دکھا ہی سکتی ہوں کہ تمہاری ایسی حالت اب میری برداشت سے باہر ہے۔" ہاجرہ کا انداز کچھ سوچتا ہوا مگر قطعی تھا۔
"حرا کی ماں خیال سے... یہ سب آسان نہیں۔" جمیل احمد نے روکا۔
"اور میرے لیے میرے بھائی کو ایسے دیکھنا آسان نہیں۔" ان کا انداز حتمی تھا۔
"کہاں آپا... کہاں؟ میں ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوں، بس ایک بار ان سب کو دیکھ لوں۔" سلیم احمد رو دیے۔
"صبر کرو سلیم احمد، میں ابھی آتی ہوں، پہلے اس جذباتی کو سمجھا لوں ایک تو آج کل کے بچوں کا غصہ اور عقل ناک پر دھری رہتی ہے ہر پل۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔
"سلیم احمد! صبر کرو یار، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جمیل احمد نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی تھی۔

☆.....☆.....☆

"اف..... بہت تھک گئی آج میں۔" کسٹمر سے فارغ ہونے کے بعد حیا دھپ سے کاؤچ پر گری تھی۔ تین ورکر لڑکیاں سارا پھیلاوا سمیٹنے اور پارلر کو چمکانے میں مصروف ہوگئی تھیں، اتنے میں زرین چھوٹے سے اسٹور سے چائے کے کپ کے ہمراہ برآمد ہوئی۔ وہاں حیا کا کاسمیٹکس کا سامان پارلر کے حوالے سے استعمال ہونے والا الیکٹرانک کا سامان رکھا جاتا تھا، ضرورت کے لیے حیا نے الیکٹرک کیتل بھی رکھی ہوئی تھی اور چائے اور کافی کا سامان بھی ورکر لڑکیاں درمیان میں ایک دو بار چائے بنا کر پی لیا کرتی تھیں۔

"جیتی رہو یار..... پارلر میں تم اور گھر میں شاہ جہان..... جب مجھے اپنے ہاتھ کی چائے پلا دیتی ہو ناں، سمجھ میں تم دونوں کی طرف سے سارے گلے شکوے بھول جاتی ہوں۔" حیا اٹھ بیٹھی اور زرین کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" چائے کا پہلا سپ لے کر اس نے زرین کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ زرین کسٹمر چیئر گھسیٹ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

"آج لیٹ کیوں تھیں؟" وہ نرمی سے بولی۔

"ارشد بگڑا ہوا تھا آج..... اس نے کہا میرے ہاتھ سے ناشتہ کرے گا اور آج میں اس کے ساتھ ہی رہوں، کیونکہ کل سے اسے بخار ہے اور بیماری میں وہ بہت چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چیختا چلاتا ہے، چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا ہے۔ تائی کے ہاتھ بھی نہیں آتا، بڑی مشکل سے اس کو بہلا پھسلا کے نکلی تھی گھر سے پھر بھی آتے آتے کافی ٹائم لگ گیا۔"

"واہ بھئی واہ..... پھر تو تمہیں یہاں پارلر میں نہیں کسی پاگل خانے میں نرس ہونا چاہیے، اچھی کیئر کر سکتی ہو پاگلوں کی اور وہ بھی بات سمجھتے ہیں تمہاری، کیا کمال کا زرخیز دماغ پایا ہے تمہاری تائی نے اور کیا زبردست پلاننگ کر کے اپنے پاگل بیٹے کو تمہارے سر منڈھ کر خود بری الذمہ ہوگئی..... میرا تو دل کرتا ہے ناں ایک جھانپڑ تمہیں رسید کروں، ایک تمہارے جاہل بھائی کو جو دونوں تایا، تائی اور اس پاگل کے سامنے بچھ گئے، اب ان کی مرضی وہ تمہیں قالین بنا کر روندتے گزر جائیں..... جوتے کی مٹی سمجھ کر جھاڑ ڈالیں یا کچرا سمجھ کر پاؤں تلے مسل ڈالیں۔" اس کے دانت پیس کر کہنے پر زرین نے سر جھکا لیا۔

"آپ کبھی ان مسائل سے نہیں گزریں حیا اور پروردگار نہ کرے جو وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے جو ہمیں کرنا پڑے کیونکہ جب آپ کے سر پر سائبان نہ رہے نہ ماں کی صورت اور نہ ہی باپ کی شکل میں تو چادر اور چار دیواری کے علاوہ بہت دفعہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی آپ نہ بھی چاہیں تب بھی آپ کو دوسرے کے سامنے بچھنا پڑتا ہے پھر سامنے والے کی مرضی کہ وہ ہمیں اٹھا کر کھڑا کر دے، کچرا سمجھ کر روندتا گزر جائے یا قالین سمجھ کر پاؤں کے نیچے مسل ڈالے، یہ سامنے والے کے ظرف پر ہوتا ہے اور ہم بہن بھائی کی بدقسمتی کہ ہمیں جو رشتے ملے ان کے ظرف کا پیمانہ بہت چھوٹا ہے۔" وہ دل ہی دل میں زرین سے مخاطب تھی۔

"اچھا سنو..... یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، تم یہ ایڈریس پکڑو، اپائنٹمنٹ میں نے لے لیا ہے، ٹائم ہوتا تو خود بھی ساتھ جاتی لیکن مصروفیت کے باعث پاسیبل نہیں ہے..... اس لیے تم اپنے بھائی کو اس سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جاؤ گی اسی ٹائم میں جب تم میرے پاس کام کرتی ہو تاکہ تمہاری اس خرانٹ تائی کو بھنک بھی نہ پڑے..... ویسے تو تم دونوں کو ہی کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے لیکن تمہارے لیے میں خود کافی ہوں۔" وہ کاؤچ پر رکھے چھوٹے سے پرس سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔



"سائیکاٹرسٹ.....؟" زرین کے لہجے میں حیرت تھی تاہم اس نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ ضرور اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"حیا....." ان کے لب بے آواز بولے تھے۔

"میری بچی..... میری جان....." آنسوؤں کا ایک دریا تھا جو آنکھوں سے ابل پڑا تھا گویا آنسوؤں کے باعث نظروں کے سامنے دھند کا ایک پردہ سا تن گیا تھا۔ جسے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے مسل ڈالا تاکہ اسے اچھی طرح سے دیکھ سکیں جیسے وہ بہت چھوٹی روتا ہوا چھوڑ کر گئے تھے تو اب اتنی بڑی دیکھ کر تو احساس زیاں مزید شدید ہوگیا تھا کہ ہائے انہوں نے اپنے ہاتھوں اولاد جیسی انمول نعمتوں کو دھتکار دیا تھا۔

"مجھے اس سے ملنا ہے آپا..... اسے گلے سے لگانا ہے، اس کا ماتھا چومنا ہے، کتنی بڑی ہوگئی میری حیا۔" وہ زور زور سے روتے ہوئے کہنے لگے۔

"بس کرو سلیم احمد، صبر کرو ابھی ایسا ممکن نہیں ہے..... وہ تو مجھ سے تمہارا تڑپنا دیکھا نہیں گیا تو تمہیں ادھر لے کر آئی اگرچہ دل سے حرا بھی راضی نہیں تھی کہ یہ سب بچیاں اس کی ذمہ داری پر یہاں آتی ہیں۔ تمہارا اس طرح اچانک منظر پر آنا بہت سے مسائل کو جنم دے سکتا ہے۔" ہاجرہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو سلیم احمد بھی آنسو پونچھتے سر ہلا کر جالی والے دروازے سے ماتھا ٹکائے اسی طرف دیکھتے رہے جہاں سے ابھی ابھی آخری پیریڈ سے فری ہو کر ساری بچیاں آگے پیچھے چلتی ہنسی مذاق کرتی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں، جب کہ وہ لاؤنج میں ہاجرہ کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں وہ ان کو لے کر تین چار گھنٹے پہلے آ گئی تھیں تاکہ مومن کو ان کی یہاں آمد کا پتا نہ چل سکے۔

"آپا..... بچیوں کو اتنے عرصے سے نہیں دیکھا تھا تو دیکھنے اور ملنے کی عجیب سی تڑپ تھی کہ ایک بار دیکھ لوں گا تو زندگی کا بچا کھچا سفر سہل ہو جائے گا، اب ایک کو دیکھ لیا ہے تو ملنے کی شدید ہڑک دل سے جاگ اٹھی ہے دل کر رہا ہے کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر بھاگ جاؤں اور اپنے جگر گوشوں کو گلے سے لگاؤں، ہائے کیا شئے ہے یہ انسان اور اس کا بے صبر اور ناشکرا پن جو اسے کسی صورت چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔" بچیوں کے جانے کے بعد مومن سمیت تین مرد اساتذہ اور دو خواتین اساتذہ بھی جب چلے گئے تو ہاجرہ سلیم احمد کو لیے لاؤنج میں صوفوں کی طرف آ گئیں تب کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں صاف کرتے سلیم احمد نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"یہ تو ہے سلیم احمد..... اولاد کو ایسے ہی تو آزمائش نہیں کہا گیا۔" ہاجرہ سر ہلا کر بولیں اسی پل چائے و لوازمات کی ٹرے کے ہمراہ حرا چلی آئی تھی۔

(ان شاء اللہ اگلی قسط آئندہ شمارے میں)

یہ دشت ترک محبت یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تیری یاد سے گزر جاؤں
میں زندہ تھا کہ تیرا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں کہ مرجاؤں

کنول انسانے کے سحر میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ بری طرح اچھل پڑی پھر بابا کو اپنے کمرے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوکر سلام کیا پھر پریشانی سے پوچھا۔

"بابا جانی خیریت تو ہے نا صبح صبح؟ آپ نے مجھے بلالیا ہوتا۔" حامد علی خان صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"بیٹا رات تمہاری امی نے تم سے تمہاری رائے مانگی تھی، تم نے کیا جواب دیا؟" اس سوال پر کنول کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں، رات ہی تو امی نے اس سے جنید کے بارے میں پوچھا تھا، ماموں کا خوش شکل اکلوتا لاڈلہ بیٹا جو بزنس کے سلسلے میں جب بھی کراچی آتا انہیں کے گھر ٹھہرتا تھا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ اس کا کبھی کراچی جانا نہیں ہوا اکثر ماموں سے فون پر بات ہو جاتی تھی میڈیکل کی ٹف پڑھائی کی وجہ سے یوں تو کبھی اس نے جنید کے بارے میں اس انداز سے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن امی کی پسند پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔

"بیٹا تم نے اپنی مرضی بتائی نہیں؟" بابا نے پھر سوالیہ کیا۔

"بابا میری اپنی کوئی رائے نہیں آپ اور امی جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔" وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

"ہوں......" حامد علی خان نے ہنکارہ بھرا اور گہری سوچ میں ڈوب گئے، ان کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں اور پیشانی پر پڑی سلوٹیں ان کی بے چینی اور خلفشار کی غماز تھیں، وہ جانے کن خیالوں میں گم تھے اور ان کی داہنی ٹانگ مسلسل ہل رہی تھی۔ کنول اندر ہی اندر پریشان ہورہی تھی، اس کو اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی اور وہ خود بھی اپنی خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سب کی نگاہوں کا محور تھی، دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن کی نظروں میں وہ سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے معتبر اور محترم تھی، گھر کے نوکر اور رشتہ دار بھی اس کو بے پناہ چاہتے تھے۔ وہ بے حد زود رنج اور حساس تھی، کسی کو بھی خاص طور پر نوکروں کو کبھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی جس پر اکثر سیخ پا ہوکر ماں اس پر غصہ کرتے تھیں۔

"بیٹا جی سدھر جاؤ سارے پیسے ان پر لٹا کر خالی ہاتھ رہ جاتی ہو، کیا ہم ان کو تنخواہ نہیں دیتے؟"

"ارے میری ماں کیوں دل جلاتی ہیں اللہ کا وعدہ ہے تم ایک پیسہ دو گے وہ دس لاکھ دے گا، اس کے خزانے میں جب کمی نہیں تو میرے دینے میں کنجوسی کیوں؟" ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر شرارت سے بابا کی طرف دیکھتی جن کی اسے بھرپور حمایت حاصل تھی۔

"میں جانتی ہوں تم حاتم طائی کی بیٹی ہو۔" وہ جل کر کہتیں کیونکہ جانتی تھیں دونوں باپ بیٹی ہمنوا ہیں، کنول کو جنید کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن حامد علی خان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خوش نہیں۔

"بابا آپ اس رشتے سے خوش نہیں؟" بالآخر اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"ارے نہیں بیٹا!" وہ شفقت سے مسکرائے۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تم ایک چکر کراچی اپنے ماموں کے گھر لگا آؤ، تمہاری امی کو یہی شکایت رہتی ہے کہ میں تمہارے ننھیال والوں کو لفٹ نہیں دیتا اس طرح ان کا شکوہ بھی دور ہوجائے گا۔"

"لیکن بابا اب جانا کیا معیوب نہیں لگے گا، اس سے پہلے تو آپ نے کبھی جانے کی اجازت نہیں دی۔"

"بس بیٹا اب ضروری ہوگیا ہے کیونکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اس لیے میں چاہتا ہوں تم وہاں جاؤ کیونکہ بہت سی چیزیں جو دور سے ہمیں خوب صورت اور پرکشش نظر آتی ہیں نزدیک آتے ہی اپنی اصلیت کھو بیٹھتی ہیں، قبل از وقت کچھ کہہ کر میں تمہیں بدگمان نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی تمہاری امی کے ساتھ جنگ کا ایک نیا محاذ کھولنا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم اس گھر کے مکینوں کے بارے میں بھی اچھی طرح جان لو جو دولت میں ہم سی کہیں آگے ہیں، جنید اچھا لڑکا ہے مگر کسی کو سمجھنے اور جاننے کے لیے تو ایک عمر بھی کم ہے اور بعض اوقات دو ناپسندیدہ اشخاص ایک ہی چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح ساری زندگی گزار دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے، ایک خاموش سمجھوتے کی زندگی اور میں نہیں چاہتا تم سمجھوتے کی زندگی گزارو، میں تمہیں تم سے زیادہ چاہتا ہوں، تمہارے مزاج کی تبدیلی ماحول کی تبدیلی سے زیادہ اہم ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کا واسطہ ایک فرد سے نہیں

پورے خاندان سے پڑتا ہے اور میں چاہتا ہوں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم ایک مرتبہ سب سے مل لو پھر تمہارا ہر فیصلہ مجھے منظور ہوگا لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا جس کا علم تمہاری امی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

"جی بابا کہیے۔" کنول نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور ہمہ تن گوش ہوئی کہ جانے کیا کہیں۔

"کراچی سے بذریعہ ہیر بائی وے تمہیں حیدرآباد کے نزدیک ایک گاؤں بھی جانا ہوگا۔"

"کیسا گاؤں؟ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"تمہارے لیے یقیناً نیا ہوگا لیکن مجھ سے پوچھو تو میرا روم روم اس کو پکارتا ہے، ہر سانس کی لے میں اس گاؤں کی صدائیں گونجتی ہیں کیونکہ یہ وہ گاؤں ہے جہاں سے میرا خمیر اٹھا تھا، جس کی مٹی نے مجھے پروان چڑھایا تھا، جس کی گود میں پل کر میں جوان ہوا تھا، جہاں میرے آباؤ اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں، جہاں میرے بوڑھے والدین، میرا ایک چھوٹا بھائی دو بہنوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔" حامد علی خان کی آواز شدت جذبات سے بھرائی اور کنول کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، لفظ گونگے ہوگئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ میرا پورا ددھیال موجود ہے اور اپنے اتنے قریبی رشتوں کو ہم سے دور رکھا، کیوں بابا جانی؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"بیٹا یہ ایک طویل داستان ہے۔" حامد علی خان کی نظریں دور کہیں ماضی کو حال میں لانے کی کوشش کررہی تھیں۔

"یوں سمجھو ایک بے وقوف دیہاتی شہر آ کر اس کی چکا چوند اور مصنوعی روشنیوں میں اپنی اوقات بھول گیا اور اپنی اصلیت بھلا دی، اونچی اڑان اڑنے کی خواہش نے زمین سے رشتہ توڑ کر خلاؤں میں معلق کردیا "نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" وہ بھول گیا کہ اس کی بچپن کی منگیتر یتیم کزن اس کی راہوں میں پلکیں بچھائے انتظار کی سولی پر

لٹکی ہوئی ہے، اس کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بوڑھے ماں باپ نے علم کی شمع روشن کرنے کے لیے گھر کے چراغوں کی لو مدھم کررکھی ہے، اور وہ سارے رشتے ناطے بھول گیا صرف ایک محبت کی خاطر اور پھر وقت اور حالات نے اس مصلحتوں کی دھول ہٹادی جب ہوش آیا، جذبات کی آندھی اتری تو وہ شخص اکیلا اور تہی داماں کھڑا تھا، بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے بھی دعاؤں والے ہاتھ اس کے سر پر سایہ فگن نہ تھے۔ وہ تو اپنے باپ کی وہ نصیحت بھی بھول گیا جو انہوں نے چلتے وقت پیار سے اس کے کانوں میں انڈیلی تھی" بیٹا ڈاکٹر بن کر اس گاؤں کی گلیوں اور مکینوں کو مت بھول جانا، ان کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے، ان کا حق شہر والوں سے زیادہ تم پر ہے کیونکہ شہر میں ڈاکٹروں کی کوئی کمی نہیں مگر یہ گاؤں محروم ہے اور تمام گاؤں والوں کی نگاہیں اور دعائیں تمہارے ساتھ ہیں کیونکہ تم ان کا مان، ان کا یقین اور بھروسہ ہو پھر تمہاری کامیابی میں تمہاری منگیتر نے بھی فراخدلی سے حصہ ڈالا ہے اور ہمارے منع کرنے کے باوجود تمہاری پڑھائی کے لیے اپنی زمین گروی رکھی ہے۔" حامد علی کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اور شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"وہ دیہاتی شہر آ کر اپنے اصل سے رشتہ توڑ بیٹھا، اپنی بنیاد اور پہچان کھودی اور تمہاری امی جو ایک بہت بڑے جاگیردار کی بیٹی تھیں ان کی خوب صورتی، شان و شوکت اور دولت نے اس کو اندھا کردیا، آنکھیں چکا چوند کردیں، دولت کی چمک تو اچھے اچھوں کو چندھیا دیتی ہے میں تو پھر ایک سیدھا سادا دیہاتی تھا، گاؤں کا پہلا بندہ جو شہر ڈاکٹر بننے آیا تھا، تمہارے نانا کی من پسند نہیں مگر تمہاری امی کی ضد تھا اور وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ میں اپنے رشتہ داروں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے باہر جاؤں گا کیونکہ ان میں جاگیرداروں والی تمام خصلتیں موجود تھیں، انسانی جذبات واحساسات سے بری، دولت کو انسانیت پر ترجیح دینے والے غرور وتکبر کی بلندیوں پر کھڑے، ہر شخص کو حقیر اور



کمتر سمجھنے والے، ان کی نظر میں گاؤں والے کیڑے مکوڑے اور دھرتی پر بوجھ تھی، بٹ پونچھیا اور چارآنے والے۔ اخلاق، محبت، انکساری، عاجزی، بھائی چارگی اور رواداری بقول تمہارے نانا کے "یہ غریبوں کے وہ ہتھیار ہیں جن سے وہ امیر نہ ہونے کی پردہ پوشی کرتے ہیں" میں نے اپنے وعدوں اور روایات کے خلاف جب یہ قدم اٹھایا تو تمہارے دادا آگ بگولا ہوگئے گھر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ان کے ہر فیصلے کو اہمیت دی جاتی تھی، مقدم سمجھا جاتا تھا پھر انہوں نے اپنے مرتے ہوئے بھائی سے بھتیجی کو بہو بنانے کا وعدہ لیا تھا ان کے لیے اپنے قول سے پھرنا مرنے کے برابر تھا انہوں نے ہمیشہ کے لیے مجھ پر گھر کے دروازے بند کردیے، اس طرح میرے لیے تمہارے نانا کی بات ماننا اور بھی آسان ہوگیا تھا۔ میں جب میڈیکل کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے پڑھنے باہر گیا تو اس کا سارا خرچہ تمہارے نانا نے اٹھایا اور جب پانچ سال بعد تمہاری شکل میں مجھے پیاری سی بیٹی ملی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ ضمیر کی خلش اور روح کی چبھن نے مجھے ہمیشہ بے چین رکھا، اب میرے پاس دنیا کی ہر آسائش، محبت کرنے والی بیوی اور پیارے پیارے چار بچے ہیں لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔ تمہاری ماں سے مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ اس سارے فیصلے میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا مگر اس نے مجھے کبھی اپنے والدین سے رابطہ کرنے کو بھی نہیں کہا۔" انہوں نے بات مکمل کرکے صوفے سے پشت لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"بابا آپ کا ان سے کبھی کوئی رابطہ نہیں ہوا؟" کنول نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں میرے چھوٹے بھائی کے بیٹے کے ذریعے جو خود بھی ایک ڈاکٹر ہے وہ اکثر میرے پاس آتا رہتا ہے۔"

"بابا جانی آپ کو بعد میں ملنے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی، ماں باپ کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے وہ یقیناً آپ کو معاف کردیتے۔"

"کیا منہ لے کر جاتا، تمہارے دادا اصول پرست، غیرت مند اور خاندانی رکھ رکھاؤ والے انسان تھے انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور چھوٹے بھائی نے ان کا بھرم رکھتے ہوئے خود ہی میری منگیتر سے شادی کرلی۔ انہیں کا بیٹا اور میرا بھتیجا جب اسی نے یہ حوصلہ مجھے دیا کہ اصل سے جڑنا ہوتا ہے شاید تمہارے ذریعے میں اپنے والدین کو منانے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"تو پھر آپ اپنے بھتیجے کو گھر کیوں نہیں لائے؟" کنول نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تاکہ تمہاری امی کو علم نہ ہوسکے اور اسی شرمندگی اور ضمیر کی چبھن سے بچنے کے لیے میں نے اپنا ٹرانسفر لاہور کروالیا تھا کہ اتنے نزدیک رہتے ہوئے میں تمہارے نانا سے کیا وعدہ توڑ بیٹھوں لیکن اب نانا، نانی تو رہے نہیں صرف ماموں ہیں تمہارے جن سے میرا کوئی ذاتی اختلاف نہیں لیکن انہیں تمام عادتیں اور خصلتیں موروثی طور پر ملی ہیں، جاگیردارانہ نظام کی پوری خوبیاں ان میں موجود ہیں غصہ، غرور، اکڑ اور غریبوں سے نفرت اور بیٹا تم تو اپنے بہن بھائیوں سے بھی کافی مختلف ہو کیسے ایڈجسٹ کروگی یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں لیکن میرے بچے میری خواہش ہے کہ کراچی سے تم ایک مرتبہ گاؤں ضرور جاؤ، جس کی مٹی اور ہرے بھرے کھیتوں سے آج بھی سوندھی خوشبو آتی ہوگی محبت اور اپنائیت کی۔ میری دعا اور تمنا ہے کہ تم شہر اور گاؤں کے درمیان ایک رابطہ، ایک واسطہ اور پل بن جاؤ۔"

"تو پھر ٹھیک ہے بابا جانی میں پہلے گاؤں جاؤں گی۔" کنول نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"نہیں بیٹا نہیں" وہ جلدی سے بولے۔

"تمہاری ماں کو ہمیشہ مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں ان کی ہر بات کی مخالفت کرتا ہوں اور اب تو یہاں معاملہ ان کے بھتیجے کا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں پہلے تم کراچی جاؤ کچھ دن وہاں رہو دیکھو، سوچو، پرکھو اور پھر فیصلہ کرو گاؤں جانے کا۔" حامد علی خان تو اپنے دل کا بوجھ

لگا کر کے اٹھ گئے لیکن کنول کو ایک امتحان گاہ میں کھڑا کر دیا تھا اگر ددھیال والوں نے اسے قبول نا کیا اور باپ کے کیے کی سزا بھی کو دی تو؟ اکثر اس نے اپنی ماں سے گاؤں کے لوگوں کی موروثی دشمنیاں، انتقام، ظلم و زیادتی اور جاہلانہ رسم و رواج کے بارے میں سن رکھا تھا۔

☆...☆...☆

دوسرے دن وہ ایئرپورٹ سے کراچی جانے کے لیے [illegible] نے خدا حافظ کہا۔ کراچی ایئرپورٹ [illegible] نے حیرت سے دیکھا جس پر قائداعظم کا نام جگمگا [illegible] اس کا پہلا اتفاق تھا۔ جنید نے [illegible] بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا، وہ اس کے لیے [illegible] بھی لایا تھا جو کنول کو بہت اچھا [illegible] خوب صورت [illegible] شہر لوگوں کی ورائٹی اور تنفس اس کی دلچسپی کا باعث تھے۔

"جنید بھائی آپ کا کراچی تو بے حد خوب صورت ہے۔"

"تمہارا بھی تو ہے۔" جنید کی برجستگی پر اسے ہنسی آ گئی۔

"ویسے تو لاہور کے لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں، بلکہ پنجابی میں ایسے کہتے ہیں مگر مجھے تو کراچی بھی کم نہیں لگا۔"

"تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، اصل میں لاہور میں گھومنے پھرنے کی بہت جگہیں ہیں، تفریح اور پکنک کے لیے [illegible] اور پارکس جبکہ کراچی میں سمندر [illegible] گھومنے پھرنے کی کوئی [illegible] "عروس البلاد" کہلاتا ہے۔"

[illegible] ایک ضعیف اور باریش [illegible] کرنے کے چکر میں سامنے آ گیا اور [illegible] ہوتے ہوتے بچا۔

"[illegible] نظر نہیں آتا۔" جنید غصے سے [illegible] گالیاں اسے دیں۔ کنول سہم [illegible] بھی ایسی گالیاں سنی تھیں پھر سارے

راستے وہ خاموش اور گم صم رہی جبکہ جنید اسی طرح ہنسی مذاق کرتا رہا۔ گھر پر حیا اور وفا نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ سب سے زیادہ اسے مامی اچھی لگیں نازک نازک، مقدس اور پاکیزہ۔ ماموں اس کو گلے لگا کر رو پڑے پھر دیر تک [illegible] گویا ہوئے۔

"دیکھو میری بھانجی پہلی مرتبہ یہاں آئی ہے اسے کوئی شکایت نہ ہو ورنہ تم مجھے جانتی ہو۔"

"ماموں یہ زیادتی ہے میرے ساتھ۔" وہ احتجاجاً بولی۔ "آپ مجھے مہمان کی جگہ وبال جان بنا رہے ہیں، مہمان تو صرف تین دن کا ہوتا ہے جبکہ میں تو زیادہ دن رہنا چاہ رہی تھی۔" اس کا موڈ ہی خراب ہو گیا۔

"ارے میری بچی تم تم [illegible] سر آنکھوں پر رہو، بس ان بےوقوف عورت کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔"

☆...☆...☆

دو چار دن میں ہی کنول گھر کے ماحول سے اکتانے لگی تھی، ہر شخص گھر میں دکھاوے اور بناوٹ کی زندگی گزار رہا تھا سوائے ممانی کے جن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ماموں کے غصے سے سب ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے رہتے تھے، جہاں ان کی آمد کا وقت ہوتا سب الرٹ ہو جاتے سوائے جنید کے جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کنول کو صبح اٹھنے کی عادت تھی، سب گھر والے نمازی تھے اور جمعہ کے دن تو بابا جانی سب بچوں کو نماز کے بعد جمع کر کے دین کی اچھی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے اور اس کام کے لیے وہ خاص طور سے ہوسٹل سے آیا کرتے تھے، بحث و مباحثہ ہوتا، اختلاف رائے کی سب کو آزادی تھی کیونکہ حامد علی خان کہتے تھے۔

"آپ کنوے کریں مگر کسی کو کنوینس نہ کریں۔" کبھی ان کو سمجھاتے۔ "بیٹا جب ہمارے پاس دلیل اور جواز نہیں ہوتا تو ہم اپنے غصے میں کمزوری کو چھپا لیتے ہیں۔"

کنول نے اندازہ لگایا کہ ماموں ہر جائز اور ناجائز بات غصے سے منوا لیتے ہیں کیونکہ کسی میں بھی سچ کہنے کی ہمت نہیں تھی اور ماموں میں سچ سننے کا حوصلہ بھی نہیں تھا



سوائے جنید کے جو ماموں کے غصے کو چٹکیوں میں اڑا دیتا تھا۔ اکثر اس کی ماں سے طرف داری جنگ و جدل کا باعث بنتی تھی، وہ ہر نقصان کا ذمہ دار ممانی کو سمجھتے اور ہر خرابی کا ذمہ دار ان کو ٹھہرا کر طنز کے تیر برساتے اور وہ بے زبان عورت خاموشی کی زبان میں شاید ہر سوال کا جواب دل ہی دل میں دیتی۔ بی اے کے بعد پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، وہ بھی ممانی کی خوشامدوں کے بعد ملی تھی اور اب ان دونوں کی زندگی کا مقصد سارا دن موبائل کا استعمال یا ٹی وی دیکھنا تھا مگر جوں ہی ماموں کی آمد کا وقت ہوتا وہ سر ڈھانپ کر [illegible] جاتیں۔ کنول سخت پریشان تھی، اس نے ایسا ماحول کہاں دیکھا تھا گو اس کی امی غصے کی تیز اور حاکمانہ طبیعت کی مالک تھیں مگر دوسری طرف حامد علی خان کی طبیعت میں تحمل، برداشت اور انکساری تھی، دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھے ہوئے تھی۔ کنول کو ممانی کے صبر و ضبط پر حیرت ہوتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا اور ممانی بھی شاید خود بھی تنہا سہتے سہتے تھک چکی تھیں اس لیے بے اختیار ٹھنڈی آہ بھر کر شروع ہو گئیں۔

"بس بیٹا نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے کہ یہ سوال تو اب تک میں خود سے بھی تنہائی میں کرتی رہتی ہوں کہ جس عورت کو وہ بڑے ارمانوں سے سر کا تاج بنا کر لائے تھے وہ آہستہ آہستہ قدموں کی دھول کیوں بن گئی؟ سچ پوچھو تو میں اب تھکنے لگی ہوں، برداشت کی حد ختم ہونے لگی ہے ضبط کی طنابیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں لگتا ہے اندر جو آتش فشاں ہے وہ پھٹ گیا تو ہر چیز کو اور ہر رشتے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا، ختم کر دے گا میرے گزشتہ کو حالانکہ میں زبان کو تالا لگا کر یہ بھول چکی ہوں کہ میں یونیورسٹی کی بہترین ڈیبیٹر، ادبی مجلے کی چیف ایڈیٹر اور ایم ایس سی میں گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ یاد تو بس اتنا ہے کہ میں دو جوان بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں ہوں، میرا وجود تو کب کا فنا ہو چکا یہ تو ایک چلتی پھرتی زندہ لاش ہے یا سمجھو فرض اور ممتا کے خمیر سے گندھی ایک مجبور اور بے بس ماں۔"

"اور یہ ماموں جو آپ کو سارا دن جاہل عورت کہہ کر پکارتے ہیں۔" کنول حیرت سے بولی۔

"یہ ان کا احساس کمتری ہے کیونکہ وہ صرف میٹرک پاس ہیں لیکن دولت کی کمی نہیں۔"

"تو پھر یہ بے جوڑ شادی کیسے ہوگئی؟" کنول کے سوال پر وہ دکھ سے مسکرائیں پھر گویا ہوئیں۔

"بس میری بچی مقدر سے کون لڑ سکتا ہے، تمہارے ماموں نے اتفاقاً یونیورسٹی میں مجھے دیکھا اور پہلی نظر میں پسند کر لیا، ہم چھ بہنیں پہاڑ جیسے باپ کے سینے پر دھری بیٹھی تھیں، بیٹا صرف ایک تھا اور انہیں ہمیں اعلیٰ تعلیم دلانے کا شوق جو انہوں نے محدود آمدنی میں بھی پورا کیا، انہوں نے اتنے اونچے اور لکھ پتی خاندان کے رشتے کو اپنی خوش بختی جانا، ویسے بھی دولت انسان کے ہر عیب چھپا لیتی ہے مگر شادی کے بعد میری یہ ڈگری میرے لیے کلنک کا ٹیکا بن گئی، ویسے بھی انہوں نے بچپن کی نسبت کو ٹھکرا کر مجھ سے شادی کی تھی، وہ بھی ماں باپ کی مخالفت مول لے کر۔ شروع کے دن تو اچھے گزرے پھر سسرال والے ان کے کانوں میں میرے خلاف زہر گھولتے رہے۔ تمہارے ماموں کی انا پرستی اور احساس کمتری۔ بوند پڑے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے وہ تو پھر انسان تھے، محبت کے سوتے خشک ہو گئے اور تمہارے ماموں محبت کا سبق بھول گئے اور میں جاگیرداروں کی سوچ کے مطابق پاؤں کی جوتی بن گئی۔ پھر میں نے صبر و شکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، زندگی گزارنے کے لیے کوئی امید، کوئی آس کا جگنو اور کوئی سنہرا خواب آنکھوں میں بسا رکھو تو زندگی سہل ہو جاتی ہے۔"

"مامی آپ نے وفا اور حیا کو بھی آگے پڑھنے نہیں دیا جبکہ آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔"

"بس بیٹا میری تو بڑی خواہش تھی مگر یہاں بھی تمہارے ماموں کی جاہلانہ سوچ آڑے آ گئی پڑھ لکھ کر

پیسہ ڈھونڈنے سے کیا فائدہ، عورت کا کام گھر کی دیکھ بھال اور بچے پالنا ہے تم نے اتنا پڑھ کر کون سا تیر مار لیا، گھر میں کس چیز کی کمی ہے، اچھا کھاتی ہیں، اچھا پہنتی ہیں، کتابی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا بیان او(ر) دولت دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔" آخر میں ان کی آواز بھرا گئی اور خود کنول کا دل بھی گداز سا ہوا اور وہ ان کو بانہوں میں لے کر پیار سے بولی۔

"بی بی آپ روئیں نہیں میرا دل دکھتا ہے، میں اس گرہ کو کھولنے کی ایک مرتبہ تو کوشش ضرور کروں گی جس نے ماموں کو جکڑ رکھا ہے۔"

☆☆☆

صبح سب کو دیر سے اٹھنے کی عادت تھی سوائے ممانی کے، ابتدا میں تو کنول بھی نماز پڑھ کر پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھی کہ ممانی کی عبادت کا وقت ہوتا تھا پھر رفتہ رفتہ وہ بھی نماز پڑھ کر لیٹنے لگی۔ اس دن اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ بے ہنگم شور سے آنکھ کھل گئی، سب ہی لاؤنج میں حاضر تھے اور ممانی کھسیا کھسیا کر اس بچے کی صفائیاں پیش کر رہی تھیں جو اس وقت زیر عتاب تھا۔

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، نوکروں کو بھی سر پر چڑھا کر رکھتی ہو، کہہ دو اس حرامزادے سے دو ہزار واپس کردے ورنہ مجھے ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا آتا ہے۔" کنول نے ممانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ آہستہ سے بولیں۔

"تمہارے ماموں کے پرس سے کسی نے دو ہزار نکال لیے ہیں اور ان کو بشیر پر شک ہے۔" وہ معصوم بارہ سال کا لڑکا جو ہر کام کے لیے دن رات رہتا تھا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور ماموں کا اٹھا ہوا ہاتھ رکنے کے لیے تیار نہیں تھا، کنول کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ بشیر کو سامنے سے ہٹا کر وہ ماموں سے بولی۔

"بس کردیں ماموں بغیر تحقیق کسی پر الزام لگانا "بہتان" کے زمرے میں آتا ہے، آپ ذہن پر زور ڈالیں ہوسکتا ہے آپ نے کسی کو دے دیے ہوں؟"

"نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، رات والٹ میں دس ہزار رکھے تھے اب آٹھ ہزار ہیں جو اسی منحوس انسان نے نکالے ہیں اور یہ جاہل عورت مسلسل اس کی طرف داری کر رہی ہے۔" شور ہنگامے سے جنید بھی اٹھ کر باہر آ گیا اور سن کر غصے سے دھاڑا۔

"ابو آپ کو کیا ہوا ہے، کل ہی تو رات آپ نے دو ہزار مجھے پیٹرول ڈلوانے کے لیے دیے تھے، حد ہے آپ کی بھی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا واپس کمرے میں چلا گیا اور بشیر نے خاموشی سے باہر کی راہ لی، ممانی نے ملامت آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو چلا کر بولے۔

"بس زیادہ ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں، یہ چھینک تماشہ دیکھیے، دنیا بشیر پر ختم نہیں ہوگئی اور کوئی مل جائے گا۔" کنول حیران ہوئی کہ ماموں کو اپنے رویے پر ذرہ برابر بھی شرمندگی نہیں تھی۔ یہاں کے ماحول سے کنول اکتا چکی تھی مگر جب بھی بابا سے آنے کو کہتی وہ پیار سے سمجھاتے۔

"بیٹا تھوڑے دن میری خاطر اور رہ لو تیل دیکھو اور تیل کی دھار پھر بے شک آ جانا۔"

☆...☆...☆

اس دن وہ رات پانی پینے کے لیے اٹھی تو دونوں بہنوں کے کمرے سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ صبا، وفا کو چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی، کنول سے رہا نہ گیا اس کو دیکھ کر دونوں کے چہرے فق ہوگئے۔

"یار تم دونوں میرا خون ہو پلیز بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

پھر حیا ہی نے بتایا۔

"وفا اپنے خالہ زاد بھائی کو پسند کرتی ہے جو اس کالج میں لیکچرار ہے جہاں سے اس نے گریجویشن کی تھی، خالہ کئی مرتبہ امی سے رشتے کے لیے کہہ چکی ہیں مگر امی منع کردیتی ہیں کیونکہ ابو ہمارے ننھیال کو بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ ان سے ملنے پر بھی پابندی ہے، کبھی امی اور ہم لوگ ابو کی غیر حاضری میں چھپ چھپا کے مل لیتے



ہیں۔" حیا کا لہجہ خود بخود تلخ ہوگیا تھا۔

"مگر کیوں؟" کنول نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ ابو کی نظر میں دولت ہی زندگی کی اساس ہے، ان کا بس چلے تو دولت کو بچھا کر سوئیں، کھائیں اور دولت کی چادر اوڑھا کر ہم سب کو سلائیں۔ انسانی جذبات اور احساسات کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں اور ہر دکھ کا درماں اور ہر تکلیف کا مداوا صرف پیسہ ہے پھر اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ ہمارا پورا ننھیال بہت پڑھا لکھا ہے، میرے نانا نے ماموں کے علاوہ خالاؤں کو پڑھایا اور میری پانچوں خالائیں پڑھے لکھے خاندان میں بیاہی ہیں، میرے سارے کزنز اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں مگر ہماری طرح روپے کی ریل پیل نہیں۔" کنول نے تسلی دی اور پھر جب اس کی ایک مرتبہ ماموں کی غیر موجودگی میں وفا کی پسند سے ملاقات ہوئی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ خوش شکل، مہذب اور باوقار لگا کنول کو۔ اس کی بات چیت سے رکھ رکھاؤ اور وضع داری نمایاں تھی، کنول کو ماموں کی سوچ پر دکھ ہو رہا تھا اس نے دونوں بہنوں کو تو تسلی دے دی تھی مگر وہ تاک میں تھی کہ کب ماموں تنہا ملیں اور وہ ان کی کلاس لے سکے۔ یہ طے تھا کہ ماموں کی اس کے ساتھ محبت میں کوئی بناوٹ یا دکھاوا نہیں تھا۔ وہی جو زبان سب کے لیے آگ برساتی تھی اسی زبان سے کنول کے لیے شیرینی ٹپکتی تھی۔ خوش قسمتی سے پڑوس میں عیادت کے لیے سب گھر والے گئے ہوئے تھے اور اس سے اچھا موقع کنول کو پھر نہیں مل سکتا تھا اس نے ڈرتے ہوئے ماموں سے پوچھا۔

"ماموں...... ایک بات پوچھوں، سچ بتائیے گا۔"

"پوچھو بھانجی، کیا تم سے جھوٹ بولوں گا، ایسا تو ممکن ہی نہیں۔"

"آخر آپ مامی پر ہر وقت غصہ کیوں کرتے ہیں؟" وہ رسانیت سے بولی۔

"کیا اس نے تم سے شکایت کی ہے، اس کی یہ مجال۔" ماموں بھڑک اٹھے اور کنول کو بھی غصہ آ گیا۔

"آپ کی سب سے بڑی کمزوری ہی یہ ہے کہ آپ بغیر جانے غصے میں آجاتے ہیں، اس لیے تو ہمارے پروردگار نے غصہ کو حرام کہا ہے۔ بھلا میں کیا اندھی ہوں، جاہل ہوں، شعور نہیں رکھتی یا بچی ہوں جو سارا دن آپ بے وجہ مامی کی کلاس لیتے رہتے ہیں، وہ تو آپ کی پسند کی شادی تھی ایسا کیا ہوا کہ مامی آپ کے دل سے اتر گئیں، آپ شبنم سے شعلہ بن گئے، لہجے میں آگ اور انگارے بھر گئے، میں جب سے آئی ہوں محسوس کر رہی ہوں کہ گھر میں ایک تناؤ کی سی کیفیت ہے، دنیا کی ہر نعمت ہونے کے باوجود کوئی مطمئن اور خوش نہیں آسیب زدہ لگتا ہے مجھے یہ گھر، آخر ایسا کیوں ہے آپ محبت کا سبق کیوں بھول گئے، معاف کیجیے گا چھوٹا منہ بڑی بات میں آپ کو سمجھ نہیں پائی۔"

"بس بیٹا... میں خود بھی اس بوجھ کو اٹھاتے تھک سا گیا ہوں۔" ماموں کے لہجے میں خجالت اور شرمندگی در آئی تھی۔ "اس شادی میں تمہارے نانا نانی کی مرضی شامل نہیں تھی اور میں جذبات میں اندھا ہو رہا تھا، لگتا تھا تمہاری مامی نہ ملیں تو مر جاؤں گا پھر میری ضد پر یہ شادی ہوئی لیکن ماں باپ نے دل سے قبول نہیں کیا اور آہستہ آہستہ انہوں نے مخالفت کا زہر میرے کانوں میں انڈیلنا شروع کردیا پھر تمہاری مامی کا بھی رویہ عجیب تھا خاموش اور گم صم، نہ کوئی شکوہ، نہ شکایت، نہ کوئی آرزو، نہ تمنا، نہ خواہش۔ مجھے لگا تمہاری مامی مجھے پسند نہیں کرتیں، وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھی لکھی اور قابلیت میں مجھ سے کہیں آگے تھیں اور میں صرف میٹرک پاس، مجھے یوں لگتا جیسے ہر شخص اس بے جوڑ شادی پر مجھ پر خندہ زن ہے اور میری کم علمی کا مذاق اڑ رہا ہے، میں سخت سے سخت ہوتا گیا یہ سوچ کر کہ کبھی تو وہ احتجاج کرے گی، ناراض ہوگی، مجھے میری زیادتی کا احساس دلائے گی مگر اس نے تو جیسے چپ کی بکل مار رکھی تھی، بیٹا ظلم اور زیادتی پر احتجاج نہ کرنا ظلم کے زمرے میں آتا ہے، میرا دل چاہتا وہ چیخے، چلائے، اپنے حق کے لیے

آواز اٹھائے، مجھ سے لڑے، جھگڑے، احتجاج کرے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور مجھے لگا وہ یونیورسٹی میں کسی کو پسند کرتی تھی اس لیے میری محبت اس پر اثر نہ کرسکی اور اس احساس نے اس کی محبت تو دل سے ختم نہیں کی مگر محبت کا انداز انتقام میں بدل گیا۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس لمحے زوردار دھماکے کی آواز سے کنول کی چیخ نکل گئی، مامی نے سب ماموں کی باتیں سن لیں اور وہ برداشت نہ کرسکیں، انہیں شدید نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

ہسپتال میں سب بے قراری سے ٹہل رہے تھے اور کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ان کو ہوا کیا ہے سوائے کنول اور ماموں کے جن کے چہرے پر پشیمانی اور پریشانی کے رنگ نمایاں تھے۔ ماں کی اہمیت اور محبت کا آج تینوں بچوں کو شدت سے احساس ہوا تھا اور جب ڈاکٹر نے ان کے ہوش میں آنے کی خبر سنائی تو سب ایک دوسرے لپٹ کر رونے لگے تھے۔

"اس وقت کوئی اندر نہیں جائے گا سوائے ماموں کے۔" جوں ہی سب نے کمرے میں جانا چاہا کنول راستے میں حائل ہوگئی اور ماموں کی طرف دیکھا جس میں شوخی کے ساتھ التجا بھی تھی، آدھے گھنٹے بعد انہوں نے باہر نکل کر سب کو اندر جانے کا اشارہ دیا اور کنول کی پیشانی چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولے۔

"سدا خوش رہو آج تم نے میری آنکھیں کھول دیں کاش مجھے یہ احساس پہلے ہوگیا ہوتا۔"

"دیر آید درست آید...... ماموں اب بھی کچھ نہیں بگڑا، زندگی کی تمام خوشیاں اب بھی آپ کی منتظر ہیں۔" ماموں کا رویہ کیا بدلا جیسے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کنول کی کوششیں رنگ لائیں اور ماموں کو یہ احساس دلائے بغیر کہ وفا جواد اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اس کا رشتہ خالہ کے گھر کرنے پر رضامند ہوگئے۔ وفا ممنون تھی تو ممانی احسان مند۔ کنول نے ماموں کو ممانی کے پاس اکیلا بھیجا تھا تاکہ وہ اپنی کوتاہیوں اور غلط فہمیوں کی معافی مانگ لیں اس کو یقین تھا کہ عورت کا دل اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کردیتی ہے اور پھر مامی تو بڑے ظرف اور دل کی مالک تھیں۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا اور جنید کی اس کے لیے پسندیدگی کوئی ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی مگر اس کو اس کے احساسات کا ادراک نہیں تھا۔ اس کی نو دولتیوں کی سی حرکتیں کنول کو اچھی نہیں لگتی تھیں، ماموں کی طرح ذرہ سی بات پر بھڑک اٹھنا اس کو تکلیف دیتا تھا۔ کنول جانتی تھی ماموں نے خود کو کافی بدل لیا ہے مگر جو چیز فطرت اور گھٹی میں شامل ہو وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں مگر ممانی کو اب اطمینان ہوگیا تھا کہ انہوں نے خود کو منوالیا ہے۔ ان کی اہمیت اور وفا کو تسلیم کرلیا گیا لیکن جنید کو پسند کرنے کے باوجود وہ ابھی تک مطمئن نہیں تھی، خاص طور پر جب ایک مرتبہ کنول سے اس کی گاڑی ہلکی سی لگ گئی اور اس نے ہنگامہ مچایا تو اس نے کنول کو حیران کردیا۔

"چلانا نہیں آتی تو گاڑی لے کر کیوں گئی تھیں، نئی گاڑی کا بیڑا غرق کردیا۔" اور اس وقت ممانی نے بیٹے کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"شرم تو نہیں آتی بجائے اس کے کہ بہنوں کی خیریت پوچھتے گاڑی کی فکر لگ گئی، جہنم میں گئی گاڑی اگر کنول کو کچھ ہوجاتا تو......" ممانی کے احساس دلانے پر جنید کھسیانا ہوا مگر کنول کا دل بہت برا ہوگیا تھا۔ اس نے کہاں ایسی مادہ پرستی اور خودغرضی دیکھی تھی۔ اس نے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔

"جنید بھائی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس دن میرا شناختی کارڈ بنا اسی دن بابا نے مجھے گاڑی دلا دی تھی اور کئی مرتبہ میں نے ٹھونکا بھی مگر شکر ہے ہمارے یہاں چیزوں کی نہیں انسانوں کو اہمیت دی جاتی ہے میرے بابا ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں اور پورے لاہور میں ان کا نام اور ساکھ ہے، کہیں تو ابھی فون کردوں نئی گاڑی آپ کو مل جائے گی پھر اس کو بیڈ روم میں رکھنا یا سونے کے پنجرے میں بند کردینا۔" وہ کہتے ہوئے کمرے میں آگئی اور پیکنگ کرنے لگی مگر جنید اس کے پیچھے پیچھے آکر معافیاں مانگنے لگا۔

"سوری کنول میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا، تم جانتی ہو مجھے غصہ جلدی آجاتا ہے پلیز تم ناراض ہوکر مت جاؤ ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گا، تم اچھی طرح جانتی ہو اس دل میں تمہارا کیا مقام اور حیثیت ہے۔" وہ جذباتی ہوگیا۔

"جنید بھائی آج نہیں تو کل مجھے جانا تو ہے اور میں ہرگز بھی ناراض نہیں ہوں صرف کہہ سکتی ہوں کہ انسان کی پہچان دسترخوان پر، سفر میں اور غصے میں ہوتی ہے۔ آپ چیزوں سے نہیں انسانوں سے محبت کرنا سیکھیں، چیزیں تو مل جاتی ہیں لیکن دل میں بال آجائے تو کبھی نہیں بھرتا۔"

☆......☆......☆

سپر ہائی وے سے جب ہائی روڈ وہ حیدرآباد پہنچی تو المنظر کے قریب اس کے کزن ڈاکٹر خسرو موجود تھے، وہ جانتی تھی حیدرآباد ایک دوست کے گھر جانے کا بہانہ کرکے وہ کس طرح ماموں کے گھر سے نکلی تھی۔ خسرو نے اس کی تصویر دیکھ رکھی تھی اس لیے اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی مگر کنول کو مایوسی ضرور ہوئی درمیانہ قد، دبا ہوا رنگ مگر آنکھوں میں ذہانت کی چمک، کشادہ پیشانی اور سیاہ گھنے بال مجموعی طور پر ان کی شخصیت باوقار تھی پھر جب انہوں نے انکساری سے بتایا کہ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں تو کنول متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"اتنا پڑھ لکھ کر آپ گاؤں میں رہتے ہیں؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر گویا ہوئے۔

"یہ کس کتاب میں لکھا ہے کنول بی بی کہ انسان پڑھ لکھ کر اپنی پہچان اور اصل کو بھول جائے۔" پھر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ "میری پوسٹنگ تو حیدرآباد کے ایک ہوسپٹل میں ہے اور میں روزانہ آؤٹ بیک کرتا ہوں کیونکہ میرے گاؤں کو میری زیادہ ضرورت ہے۔" پھر سارے راستے وہ اشتیاق سے گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں پوچھتی رہی۔ کچے پکے راستوں اور گرد نے اس کی طبیعت میں کافی بیزاری پیدا کردی تھی اگر اے سی کی وجہ سے گاڑی کے شیشے بند نہ ہوتے تو اب تک وہ دھول سے اٹ کر بھوت بن چکی ہوتی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی بلاوجہ بابا کی باتوں سے جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہوکر گاؤں آگئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے خسرو ہنس کر بولے۔

"تم تھک گئی ہوگی، بس گھر آنے ہی والا ہے۔" خسرو کا معذرت خواہانہ انداز بھی اس کی بوریت کم نہ کرسکا اچانک گاڑی نے یوٹرن لیا تو ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے چوکیدار نے ہارن کی آواز پر گیٹ کھولا اور لمبے ڈرائیو پر گاڑی رکی تو کنول حیران ہوئی۔ اس کی سوچ کے برخلاف سندھ کی تہذیب و ثقافت کا نمونہ پرشکوہ عمارت اس کے سامنے تھی۔ اس کا اپنا گھر بھی لاہور کے پوش علاقے ڈیفنس میں تھا مگر اس گھر کی تو شان ہی نرالی تھی۔ پھول دار ٹائلز، رنگین شیشوں والی کھڑکیاں اور بڑا سا سرسبز لان جس میں چنبیلی کی کلیاں، گلاب اور گیندے کے سفید پھول سر اٹھائے کھڑے تھے۔ یہ عمارت آس پاس کے ماحول میں قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی، اندر داخل ہوتے ہی کنول کے قدم جم سے گئے تھے۔

"اگر آپ جائزہ لے چکی ہوں تو اندر چلیں۔" سچ تو یہ ہے کہ عمارت کی خوب صورتی نے کنول کو مسحور کردیا تھا، عجب انداز تھا رنگین شیشوں کا عکس کہیں کہیں دیواروں پر نمایاں ہورہا تھا۔ رنگین دیدہ زیب اجرکوں کا ایک علیحدہ حسن تھا، خسرو نے شاید کسی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی، بڑا دروازہ بڑے زور سے کھلا تو کنول نے خود کو ایک بڑے سے ہال کے درمیان پایا جس کے چاروں طرف کمرے تھے اور ماربل کی دیدہ زیب سیڑھیاں سنہری ریلنگ کے ساتھ اوپر جارہی تھیں۔ خسرو نے زور سے آواز لگائی۔

"سب لوگ کہاں ہیں، دیکھیں ہمارے گھر کون آیا ہے۔" خسرو کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔ کمروں اور سیڑھیوں سے لوگوں کو اترتے دیکھ کر کنول نروس ہوئی۔

دادا کے چہرے پر روایتی جاہ و جلال ٹپک رہا تھا، سفید بڑی سی پگڑی، سفید داڑھی ان پر خوب بج رہی تھی۔ خسرو کے تعارف کراتے ہی جیسے ہلچل سی مچ گئی۔ دادی کی نرم گرم پرجوش آغوش میں وہ موم کی طرح پگھل گئی، سارے خدشات اور واہمات بھاپ کی طرح فضا میں تحلیل ہوگئے، دادا نے گلے لگایا تو آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہوگئی تھی، اس کا خیال تھا چچا چچی کے انداز میں بے رخی ہوگی کہ وہ اس شخص کی بیٹی تھی جس نے بچپن کی منگیتر کو ٹھکرایا تھا مگر یہاں تو ہر شخص کا ضمیر محبت کی مٹی سے گندھا ہوا تھا، سب رو رہے تھے۔ چچا کے سینے سے لگ کر اسے باپ کی خوشبو محسوس ہوئی۔

"بہت ہوگیا بھئی اب ہمیں بھی اپنی خوب صورت سی کزن سے ملنے دیں۔" ایک معصوم سی لڑکی نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

"مجھے فریہ کہتے ہیں۔" وہ گرم جوشی سے بولی۔

"ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔" پیچھے سے آواز آئی تو کنول نے سر اٹھا کر دیکھا اسی کی عمر کا لڑکا شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی بازل ہے، تم سے ایک دو سال چھوٹا۔" خسرو نے مسکرا کر تعارف کرایا۔

"بھائی۔" بازل بھنا کر بولا۔ "ایک اور باجی...... اف میرے لیے پہلے دو کم تھیں سارا چانس ضائع کردیا۔" پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کنول تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس قدر گرم جوشی اور محبت سے اس کا استقبال کیا جائے گا۔ دادی اور دادا ایک منٹ اس سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھے اور مسلسل آنسو بہا رہے تھے۔ کنول شرمندگی محسوس کررہی تھی نہ کوئی طنز، نہ طعنہ اور نہ پرانی باتوں کا ذکر۔

"بس کریں دادی کتنا روئیں گی، لگتا ہے آپ کو کنول کے آنے کی کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔" خسرو نے شرارت سے کہا تو دادی نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی پھر اسے گلے لگاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"تو... تو ویسے ہی میرے جگر کا ٹکڑا ہے مگر کنول کو یہاں لاکر جو تو نے مجھ پر احسان کیا ہے اس کا صلہ تو رب دے گا لیکن اپنی بچی سے مل کر میں تو جی اٹھی ہوں، مجھ میں توانائی آگئی ہے۔" فریہ نے کنول کو اس کے کمرے میں پہنچایا جو جدید طرز پر آراستہ گھر کے مکینوں کی خوش ذوقی کا ثبوت تھا۔ سب سے پہلے اس نے بابا سے بات کرکے خیریت کی اطلاع دی، ان کو اطمینان دلایا پھر نہا کر جو بستر پر لیٹی تو فریہ کے دروازہ ناک کرنے پر آنکھ کھلی۔

"بھئی بہت سولیں اب چلو سب تمہارا کھانے پر انتظار کررہے ہیں اور دادا دادی کی بے چینی حد سے بڑھ گئی ہے۔" کنول کو بناوٹ سے عاری اپنی یہ کزن بہت اچھی لگی۔ دادا دادی نے اس کو اپنے بیچ میں بٹھایا تب ہی پیچھے سے آواز آئی۔

"کنول میں ربیعہ ہوں۔" کنول کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہ خسرو کی بڑی بہن ہے۔ وہ گرم جوشی سے گلے ملی لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ گرم جوشی جس کا سب نے مظاہرہ کیا تھا یہاں مفقود تھی۔

"بیٹا ربیعہ قریب کے گاؤں میں بیاہی ہے، اس کے دو بیٹے ہیں اور یہ ہائی اسکول میں پڑھاتی ہے۔" دادی نے پیار سے کہا اور پھر اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا جب اسے معلوم ہوا کہ فریہ میڈیکل کالج نوابشاہ کی طالبہ ہے اور چھوٹا بازل Lums لاہور کا اسٹوڈنٹ ہے۔

"کمال ہے بازل تم لاہور میں رہتے ہوئے بھی کبھی ہمارے گھر نہیں آئے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا پھر بازل نے ہی بات سنبھالی۔

"باجی مجھے کیا خبر تھی کہ اتنی خوب صورت کزن وہ بھی ڈاکٹر بیمار پڑنے پر آپ کی خدمات ضرور حاصل کرتا؟"

"کیوں کیا لاہور کے سارے ڈاکٹر مرگئے ہیں؟" ربیعہ تڑخ کر بولی اور میز سے اٹھ کر چلی گئی لیکن کنول نے ماحول کے تناؤ کو محسوس کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔



"ربیعہ باجی نے صحیح کہا میں ایسی کون سی ٹاپ کی ڈاکٹر ہوں ابھی تو میرا ہاؤس جاب بھی مکمل نہیں ہوا۔" اس کے جملے نے ماحول کے بوجھل پن کو کچھ کم کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کنول دو چار دن میں ہی سب سے گھل مل گئی تھی لیکن اب اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا مگر باپ کی وجہ سے مجبور تھی۔ دادا دادی نے گو بیٹے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن کنول کو اندازہ تھا انا آڑے آرہی ہے ورنہ بیٹے کے لیے وہ کتنے بے چین ہوں گے۔ اس نے سب کے ساتھ مل کر آس پاس کے سارے علاقے دیکھ لیے تھے بلکہ وہ اسے ٹھٹھہ کا تاریخی شہر بھی دکھالائے تھے جس کی بادشاہی مسجد نے لاہور کی یاد تازہ کردی تھی۔ ٹھٹھہ جہاں ایشیاء کا سب سے بڑا قبرستان تھا پھر مکلی پر عبداللہ شاہ اصحابی کا مزار جہاں پہنچ کر کنول نے ایک ہی دعا مانگی۔

"یا اللہ میرے بابا کو دادا دادی سے ملادے اور وہ انہیں معاف بھی کردیں۔" اس نے محسوس کیا خسرو کو گھر میں نہیں باہر بھی پورے گاؤں میں ایک خاص مقام حاصل ہے، سب کے دل میں اس کے لیے محبت اور احترام کا جذبہ ہے، بلاشبہ اس کے دھیمے لہجے میں تسخیر کرنے کی صلاحیت اور طاقت تھی، اس کی ظاہری شخصیت خوب صورت نہ تھی لیکن باطن بہت اجلا تھا اگر دل کی دنیا جنید کے تصور سے آباد نہ ہوتی تو وہ کنول کے تخیل کے عین مطابق تھا مگر اس دل کا کیا کرتی جو ایجاب و اقرار کی منزلیں طے کیے بغیر ہی جنید کے نام پر دھڑکتا تھا۔ خسرو کا گاؤں عام گاؤں کے مقابلے میں جدید سہولیات سے آراستہ تھا اور یہ سب خسرو کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ تھا۔ ایک ڈسپنسری اور میٹرنٹی ہوم بھی اس کی کوششوں سے قائم ہوگیا تھا لیکن گائنی کی ڈاکٹر ناپید تھی، ایک سسٹر اور ایل ایچ وی نارمل ڈلیوری کیس نبٹاتی تھیں۔ شام ایک گھنٹہ خسرو بھی یہاں مفت علاج کے لیے آتے تھے۔ ہر طرف اس کے اخلاق اور انکساری کی دھوم تھی، حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کا اندر خوب صورت ہو تو اس کا عکس باہر بھی نمایاں ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس دن وہ دادا دادی کے کمرے میں جانے لگی تو اپنا نام سن کر غیر ارادی طور پر رک گئی۔

"آخر کیوں آپ کنول سے بیٹے کے بارے میں نہیں کرتے نہ مجھے کرنے دیتے ہیں، میں ترس گئی ہوں اس کی شکل دیکھنے کو، اس کی آواز سننے کو، کیا یہ حسرت لیے میں دنیا سے گزر جاؤں گی؟" دادی بری طرح رو رہی تھیں۔

"آپ اسے معاف کیوں نہیں کردیتے، کب تک اس سے ناراض رہیں گے؟"

"بھلی مانس... کس کو معاف کروں، کیا اس نے کبھی معافی مانگی؟ وہ کبھی یہاں آیا۔ بس اس سے ناراض تھا مگر اس کو تو مجھ سے خفا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس کے لیے گھر کے دروازے بند کیے تھے دل کے دروازے تو نہیں اگر باپ ہونے کی حیثیت سے ناراض ہونا میرا حق تھا تو بیٹا ہونے کے ناطے مجھے منانا اس کا فرض نہیں تھا، تم ماں ہو رو رو کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی ہوں مگر میں مرد ہوں رو نہیں سکتا مگر باپ بھی تو ہوں، تم کیا جانو کیسے میں نے ہر ہر لمحہ اس کی جدائی میں تڑپ تڑپ کر گزارا ہے مگر تم چاہتی ہو میں اولاد کے سامنے جھک جاؤں تو یہ ناممکن ہے، میں ٹوٹ تو سکتا ہوں مگر جھک نہیں سکتا۔" کنول خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

دو دن سے خسرو غائب تھے ان کا موبائل بھی بند تھا، سب سے شدت سے کنول کو خسرو کا انتظار تھا، سب گھر والے پریشان تھے اچانک بڑی گیٹ کھلنے کی آواز پر چونک گئے۔

"بھائی آگئے۔" فریہ چیخی پھر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، بابا اماں دونوں بھائی اور چھوٹی بہن ربیکا خسرو کے ساتھ داخل ہورہے تھے۔ عجیب جذباتی سین تھا۔ سب رو رہے تھے اور کنول بار بار خسرو کا شکریہ ادا کررہی تھی۔

''پاگل ہو سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے، تمہارے آنے سے انا کا بت پاش پاش ہوا اور دلوں پر جمی برف پگھلی، کاش تم پہلے آجاتیں۔'' خسرو کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی، فریہ کی نظر دونوں کو سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر کسی احساس سے چمک اٹھیں۔ صبح کے قریب جب سب سونے کے لیے کمرے میں چلے گئے تو بابا چاچا کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے شرمندگی سے بولے۔

''میں تم دونوں سے بے حد شرمندہ ہوں مگر ایک بات واضح کردوں اگر مریم بیچ میں نہ آتی تب بھی میں ناعمہ سے شادی نہ کرتا وہ ہمیشہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز رہی کہ ہماری کوئی بہن نہیں تھی۔''

''بھائی جان آپ شرمندہ نہ ہوں ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں آپ کو ندامت اور جرم کے احساس سے نکال دوں جو آپ کے سینے پر ایک بوجھ کی طرح دھرا ہے۔ اگر آپ انکار نہ کرتے تو ہم تینوں ایک ان دیکھی آگ میں جلتے رہتے کیونکہ میں اور ناعمہ کبھی زبان نہ کھولتے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، آپ کے فیصلے نے ہماری امنگوں، آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کردی۔ ہمیں نئی زندگی مل گئی اور بابا یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے انکا بھرم رکھ لیا، اسی لیے میرا بیٹا مسلسل آپ سے رابطہ میں رہا۔'' حامد خان کو لگا ان کے سینے سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا، روح ہلکی پھلکی اور پرسکون ہوئی۔ انہوں نے بڑھ کر بھائی کو سینے سے لگالیا۔ اب کنول بہت خوش تھی اور اس کو واپس جانے کی جلدی بھی تھی تاکہ ماں کو بتاسکے کہ جنید ہی اس کی پسند ہے۔

☆......☆......☆

وہ ایک ایسا ہی خوشگوار دن تھا جب شام کے وقت خسرو گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''کنول تم نے چھ ماہ گائنی میں ہاؤس جاب تو کی ہے ناں؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''جی...... پر کوئی خاص تجربہ نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔

''فوراً میرے ساتھ چلو ایک سیریس کیس ہے اور ڈاکٹر چھٹی پر ہے۔'' کنول کو ڈاکٹر حامد کی بیٹی ہونے کی وجہ سے ٹریننگ میں کافی اہمیت دی جاتی تھی ورنہ کیسز میں زیادہ تر سینئر ڈاکٹرز جونیئرز سے نرسوں والا کام لیتے ہیں اس لیے کنول کو اچھا خاصہ تجربہ تھا۔ نرس کی مدد سے کنول نے اس مہارت سے کیس ہینڈل کیا کہ ماں اور بچے دونوں کی جان بچ گئی۔ پہلا اور وہ بھی بیٹا جس کو گاؤں والے بہت اہمیت دیتے ہیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کنول کو اپنی پلکوں پہ بٹھائیں۔ نرس اور خسرو دونوں ہی مشکور تھے اور نرس کا اصرار تھا آپ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائیں۔

''میں کوئی پاگل ہوں جو شہر چھوڑ کر اس جنگل میں رہوں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر ہنس کر بولی۔

''ابھی تو میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور پھر اپنا گھر چھوڑ کر میں کیسے رہ سکتی ہوں۔''

''ویسے آپ چاہیں تو رہ سکتی ہیں۔'' خسرو نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' کنول نے حیرت سے پوچھا۔

''فرصت سے بتاؤں گا فی الحال تو گھر چلیے چچی پریشان ہورہی ہوں گی کہ کہیں میں نے آپ کو اغوا تو نہیں کرلیا۔'' خسرو شوخی سے بولے تو کنول کو ہنسی آگئی۔

''اول تو میں اتنی آسانی سے اغوا ہونے والی نہیں اور وہ بھی آپ کے ہاتھوں جو نیکی اور پارسائی کی اتنی بلندی پر ہیں کہ کوئی گمان بھی نہیں کرسکتا مجھے تو آپ انسان کم فرشتہ زیادہ لگتے ہیں۔''

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توہین ہوتی ہے
میں بسجود ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دو

''کنول انسان بننا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں کہ اللہ نے انسان کا درجہ تو فرشتوں سے بھی اونچا رکھا ہے اور وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہ میری فطرت کا حصہ ہے میں کسی کو خود سے کمتر نہیں سمجھتا اس لیے کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ انسانیت، محبت، اخوت اور بھائی چارگی پر یقین رکھتا ہوں، دکھی انسانیت کی خدمت کرنا میں احسان نہیں فرض سمجھ کر کرتا ہوں، مجھے نہ کسی کی ستائش کی ضرورت ہے نہ واہ واہ کی۔ میرا تو ایمان بھی ہے کہ ہر انسان کا دوسرا انسان پر حق ہے مگر ہم صرف اپنے لیے جیتے ہیں اور اپنے ہی لیے سوچتے ہیں، ہر شخص خودغرض اور لالچی ہے، پتہ نہیں ہم دوسروں کی تکلیف اور آنسوؤں کو اپنے دل پر گرتے کیوں محسوس نہیں کرتے۔'' وہ متانت اور سنجیدگی سے بولے۔

''کبھی میں سوچتا ہوں لوگ عزت، شہرت، دولت اور شان وشوکت کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں، بے شک میرے رب نے فرمایا ہے ''کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو، بخیل نہ بنو اور اپنے پیٹوں کو آگ کا ایندھن نہ بناؤ'' مگر ہر شخص دولت کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہا ہے یہ سوچے بغیر کہ جانا تو ایک دن خالی ہاتھ ہی ہے، ہمارا ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اگر ہر شخص ایمان داری سے زکوٰۃ دے اور ٹیکس جمع کردے تو یقین کرو یہاں کوئی بھی بھوکا نہ سوئے، تم سوچ رہی ہوگی یہ سب لفاظی اور کتابی باتیں ہیں لیکن اپنی حد تک میں اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں اور شکر الحمدللہ اس میں میرے گھر والوں کا تعاون بھی شامل ہے۔'' کنول آنکھ بند کرکے خسرو کے الفاظ پر یقین کرسکتی تھی، وہ ایسا ہی تھا سچا، ایمان دار، کھرا اور وطن پرست اگر جنید کی تصویر پہلے ہی اس کو دماغ و دل پر قبضہ نہ کرتی تو خسرو یقیناً اس کا آئیڈیل ہوتا۔

☆......☆......☆

اس کے دونوں بھائی اور بہن یہاں کی کھلی فضا اور صاف ستھری ہوا میں بہت خوش تھے۔ عموماً گھومتے پھرتے رہتے چونکہ کنول پہلے ہی سب کچھ دیکھ چکی تھی اس لیے زیادہ تر گھر پر رہتی۔ وہ جانے کس کے خیال سے کچن کی طرف جارہی تھی جب ربیعہ کی آواز سن کر رک گئی کیونکہ موضوع وہ تھی۔

"دادی یہ کبھی نہیں ہوسکتا، یہ اس ماں کی بیٹی ہے جس نے بیٹے کو آپ سے جدا کر کے ساری زندگی آپ کو خون کے آنسو رولایا آپ بھول سکتی ہیں میں نہیں، یہ شہر کی لڑکیاں خوب گاؤں کے لڑکوں کو پھانستی ہیں مگر میں اس مرتبہ ایسا ہونے نہیں دوں گی۔" ربیعہ کے لہجے میں حقارت تھی۔

"بیٹا کنول اپنی ماں سے بالکل مختلف ہے، تم نے بلاوجہ اس کی طرف سے دل میں غبار پال رکھا ہے۔" دادی نے ربیعہ کو پیار سے سمجھایا۔

"کمال ہے دادی ساری زندگی آپ سے سنا جس گھر سے لڑکی لیتا ہے اس کی ماں کو دیکھو تو دیکھ تو لیا ماں کو وہ تایا کی وجہ سے مارے باندھے آتو گئی ہیں مگر ان کے چہرے پر خشونت اور تیوریوں پر بل دور سے نظر آتے ہیں، وہ ہرگز نہیں مانیں گی اور پھر ایک مرتبہ دلوں میں میل آجائے گا مجھے تو حیرت خسرو پر ہے اور اس کی خواہش پر آپ بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔"

"بیٹا یہ صرف خسرو کی نہیں پورے گھر کی خواہش ہے، وہ ماں کا نہیں باپ کا پرتو ہے، خوش مزاج اور خوش اخلاق بے شک حامد نے انہیں مرضی کرلی مگر فطرت تو نہیں بدلی۔" دادا نے ربیعہ سے کہا۔

"دادا آپ کی بات سے تو مجھے بھی اتفاق ہے کنول بہت مختلف ہے مگر میں ڈرتی ہوں اس وقت سے جب آپ کو انکار کی ذلت اٹھانی پڑے اور بڑھاپے میں منہ کی کھانی پڑے۔ تائی زمین آسمان ایک کردیں گی مگر اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گی اور پھر کنول جو ساری زندگی ایک بڑے شہر میں رہی ہے گاؤں کے ماحول کو کیسے برداشت کرے گی، چند دن رہنے اور مستقل رہنے میں بڑا فرق ہے؟" کنول خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی اس کو رہ رہ کر سب پر غصہ آرہا تھا، ان سب نے سوچ بھی کیسے لیا وہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں تھی، تعلیم نے اسے شعور اور آگہی دی تھی، یہ چند دن کا نہیں پوری زندگی کا معاملہ تھا، جنید درمیان میں نہ ہوتا تب بھی اس کا فیصلہ انکار ہی کی صورت میں ہوتا اور پھر پاپا اور ماما تو کبھی بھی اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں کرتے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح پر لگا کر اڑ جائے اور ٹیرس پر آئی تو خسرو میڈیکل بکس لیے سرونٹ کوارٹر سے آرہے تھے، اس کے پوچھنے پر بولے۔

"چاچا خیرو کا بچہ گھر میں گر گیا تھا اس کی پٹی کرنے گیا تھا، شکر الحمدللہ اب بہتر ہے اور تم کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو خیریت تو ہے ناں؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"میں ٹھیک ہوں، دل گھبرا رہا ہے بس اپنے گھر جانا چاہ رہی ہوں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"کیوں کیا کسی نے کچھ کہہ دیا؟" وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے نرمی سے بولے۔

"مجھے کسی نے کیا کہنا ہے، مجھے اپنا ہاؤس جاب مکمل کرنا ہے اور مجھے جلد از جلد گھر جانا ہے۔" کنول نے بے رخی سے جواب دیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی اور خسرو کی پرسوچ نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اس نے پیکنگ کی اور پاپا ماما کے کمرے کی طرف چل دی، دونوں بھائی اور بہن بھی موجود تھے، اپنا نام سن کر وہ بے ساختہ دروازے کی اوٹ میں ہوگئی، موضوع گفتگو وہی تھی۔

"میں کہے دے رہی ہوں حامد، میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، میری بیٹی شہر میں پلی بڑی ہے اور اس پینڈو کے ساتھ ایک دن بھی گزارا نہیں کرسکے گی، ڈگریوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا، میری بیٹی کا اس ماحول میں دم گھٹ جائے گا، مٹی دھول، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور گندے مفلس لوگ، کیا ہے اس گاؤں میں۔" انہوں نے حقارت سے کہا۔

"تم نے بھی تو ایک پینڈو سے شادی کی تھی۔" غصے کے باوجود حامد علی خان نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔



"ہاں تو میں کون سا گاؤں میں رہی اور میں نہیں چاہتی کہ اس غلطی کو دہراؤں اور ایک بکھرا ہوا مرد مجھے ملا تھا وہی میری بیٹی کا بھی نصیب بنے، وہ میری بیٹی ہے، میری مرضی پر چلے گی۔" ان کے لہجے میں فخر اور غرور تھا۔

"مریم...... تم اچھی طرح جانتی ہو میں کنول کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔ وہ میری بیٹی ہے، میرا مان، میرا فخر اور غرور۔ اس نے ہمیشہ اپنی پسند پر میری پسند کو ترجیح دی ہے، وہ انڈس ویلی جانا چاہتی تھی مگر میری خاطر اس نے میڈیکل لائن جوائن کی، ہمیشہ اس نے دنیا کو میری آنکھوں سے دیکھا۔" حامد علی خان کے لہجے میں کنول کے لیے فخر، مان اور یقین بول رہا تھا۔

"مگر یہ لمحوں کا نہیں ساری زندگی کا معاملہ ہے، یہ کوئی کریلے قیمہ نہیں جو آپ کو پسند ہے اس لیے وہ بھی کھا لیتی ہے اور نہ یہ کوئی جینز ہے جو پسند ہونے کے باوجود آپ کی وجہ سے نہیں پہنتی، یہ اس کی زندگی ہے جس کو اپنی مرضی سے گزارنا اس کا حق ہے، میں اس کو آپ کی خواہشات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی، میں جانتی ہوں اس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ جنید کی طرف جو پڑھا لکھا اور مہذب ہے، بجتا بھی ہے اور جچتا بھی جبکہ خسرو کو دیکھیں کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی، میری خوب صورت بیٹی کے تو وہ خاک پا بھی نہیں۔" مریم نے غرور سے کہا۔

"مریم...... تم حد سے بڑھ رہی ہو، بے شک تم کنول کی شادی اپنی مرضی سے کرنا لیکن یوں کسی کو ذلیل مت کرو نہ مذاق اڑاؤ، اللہ کو پسند نہیں یہ غرور و تکبر اللہ کا خوف کھاؤ۔" حامد کا لہجہ تلخ ہوگیا، اس سے پہلے کہ ماحول میں تلخی پیدا ہو کنول اندر داخل ہوگی۔ مریم نے اسے بے ساختہ خود سے لپٹایا اور بولی۔

"میری جان تمہارا یہ پینڈو ددھیال ساری زندگی تمہیں یہاں رکھنا چاہتا ہے، انہوں نے خسرو کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے اور صرف تمہارے ابوان کے ہمنوا ہیں، تم اچھی طرح جانتی ہو میں نے کسی کو تمہارے لیے چنا ہے اور مجھے یقین ہے اس میں تمہاری رضا بھی شامل ہے۔" مریم نے اطمینان سے کہا تو کنول کی نظریں بے ساختہ باپ کی طرف اٹھیں جن کی آنکھوں میں ایک التجا، ایک مان اور ایک امید کی کرن تھی، بھروسہ، یقین اور فخر وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں پا رہے تھے اور کنول خاموشی کی زبان اچھی طرح سمجھتی تھی، اس کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

"ماما مجھے خسرو بھائی کا رشتہ منظور ہے، میری طرف سے ہاں کردیں۔" سب کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ ابھی تو محبت نے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا تھا، کلی پھول نہیں بنی تھی، ابھی تو جذبات کی کشتی کنارے پر تھی اور جنید سے کوئی عہد و پیماں بھی نہیں ہوئے تھے پھر کیسے باپ کا مان توڑ دیتی، ان کے فخر و غرور کو خاک میں ملا دیتی۔ سب سے بڑھ کر اسے ماں کو غلطیوں کا کفارہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ ان کے حصے کا تاوان بھگتنا تھا، اس کو ثابت کرنا تھا کہ لڑکیاں صرف ماں پر نہیں جاتیں کبھی کبھی باپ کا بھی پرتو ہوتی ہیں، دل کی دنیا کا کیا ہے اجڑتی ہے تو اجڑ جائے۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

اس نے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا ساری پیکنگ کھولی اور بستر پر دراز ہوگئی تھی۔

# گیلی مٹی

ثنا شریفی

اک فسانہ ہے زندگی لیکن
کتنے عنوان ہیں اس فسانے میں
چاک والاں کی خیر ہو یارب
ہاتھ گستاخ ہیں زمانے کے

کچے صحن کی فضا میں رچی بسی گیلی مٹی کی خوشبو ہر سانس کے ساتھ اندر اتر رہی تھی۔ شہتوت کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھی صابرہ جس کے مٹی میں لتھڑے دونوں ہاتھوں کے درمیان چاک پہ چڑھا لٹو کی طرح گھومتا گیلا مٹی کا پیالہ تھا جو ابھی نامکمل تھا۔ تکمیل کے لیے ابھی نا جانے اور کتنی دیر کتنے بل آگے لٹو کی طرح گھومنا تھا۔ گیلی مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کے درمیان نا جانے ابھی اس حالت میں چاک پہ اور کتنی دیر چڑھے رہنا تھا کہ پھر کہیں جا کر کمال ہونا تھا۔ بات صرف مکمل ہونے پہ ہی ختم نہ ہوتی تھی۔ گیلی مٹی کے گیلے پیالے کو دھوپ میں نا جانے کتنی دیر تک اپنا آپ جلانا تھا اور جب یہ جلن گیلی مٹی کے ایک ایک پرت سے گزرتی آخری پرت تک پہنچتی تھی تب جا کر اس کے گیلے تن کو خشک ہونا تھا۔ مکمل خشک، اتنا خشک کہ اس میں پانی بھر کر اسے پھر سے گیلا کرنے پہ گیلی مٹی کو کوئی فرق نہ پڑے۔ ٹوٹنے، نہ چٹخنے۔

☆......☆......☆

کولی دو دن مٹی کے گیلے برتنوں کا ڈھیر اپنے گرد سجائے وہ درمیان میں بیٹھی تھی۔ چاک پر چڑھا کوئی اور نیا برتن اس کے گیلے ہاتھوں کے درمیان تھا۔ اس کے دائیں طرف کوئی آٹھ دس صراحیاں تھیں، بائیں طرف مٹکے تھے۔ صراحیوں کے پاس ہی کوئی چھ سات مٹی کے پیالے بھی رکھے ہوئے تھے۔

ابھی سب کسی نہ کسی حد تک گیلے تھے۔ خشک کرنے کے لیے انہیں یہاں وہاں ترتیب کے ساتھ سلیقے طریقے سے جو کہ صابرہ کی ذات کا خاصا تھی اس نے رکھا ہوا تھا۔

فضا میں دو ہی چیزیں شامل تھیں، گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور چاک پہ چڑھے تیزی سے گھومتے اس گیلے برتن کے گھومنے کی آواز ”گھوں گھوں“ یوں لگتا تھا کہ کوئی عاشق، عشق کا جام پیے اپنی ہی دھن میں بس گھومے چلے جا رہا ہے۔

بےخود...... ہوش سے بیگانہ...... دیوانہ وار......

ذرا چھاؤں میں چارپائی ڈالے نوری یکسوئی سے اس رقص کو تک رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سے تکتے اسے جیسے لگنے لگا تھا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ گھومنے لگی تھی۔

”ناشتہ مل جائے گا آج؟“ یہ تیز چیز جو فضا میں شامل ہوئی تھی وہ تھی اکبر علی کی آواز۔ کرخت، سخت، ہر طرح کی نرمی سے عاری، اس کی آواز ایسی ہی تھی، وہ خود بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ سخت و کرخت اور ہر طرح کی نرمی سے عاری۔

”بس میں ابھی لائی۔“ جواب حد درجہ بوکھلاہٹ بھرے انداز میں دیا اور اس بوکھلاہٹ کے ساتھ وہی ہوا جو روز ہوتا تھا بلکہ ”بلاناغہ“ چاک پہ چڑھا برتن صابرہ کے مٹی میں لتھڑے ہاتھوں کے درمیان لٹو کی طرح گھومتا اپنی تکمیل سے پہلے ہی ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔

کوئی مسئلہ نہیں ایک برتن ہی تھا کہ ٹوٹ گیا...... روز ہی ٹوٹتا تھا کبھی صبح ناشتے کے وقت تو کبھی دوپہر کھانے کے وقت اکبر علی کی آواز سن کر، یہ نہیں کہ اس کی آواز کی طاقت تھی جو اس گیلے ادھورے برتن کو مکمل ہونے سے پہلے توڑ دیتی بلکہ یہ تو ٹوٹتا ہی اس کی بوکھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے تھا۔

وہ جو ذات کی سفالہ نہیں تھی ضرورت نے اس کو سفالہ بنا دیا تھا۔ صابرہ کے پچھلوں میں کوئی سفال گر نہیں تھا۔ کوئی سفالہ نہیں تھی۔ وہ تو بس یونہی اس نے اپنے قصبے کی معمر سفالہ سے یہ ہنر سیکھ لیا تھا۔

”اماں ایک پیالہ اور ایک صراحی بنی ہے۔“ دس سالہ صابرہ اس معمر سفالہ (جو کہ اس قصبے کی واحد سفالہ تھی) سے ہی مٹی کے برتن خریدنے آئی تھی، پیالے، صراحیاں، مٹکے، پلیٹیں اور نہ جانے مٹی کا کیا کچھ۔ چاک پہ چڑھے ان مٹی کے گیلے برتنوں کو دیکھ کر وہ دس سالہ بچی کھوئی جاتی تھی۔

”اماں اسے میں بناؤں؟“ پہلی بار دل میں برتن بنانے کا شوق اٹھا تھا۔

”تو......“ معمر سفالہ شفقت سے مسکرائی تھی۔

”ہاں اماں مجھے بہت اچھا لگتا ہے یہ بنانا۔“ صابرہ نے جوشیلے انداز میں دل کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

”مشکل کام ہے پتر۔“ معمر سفالہ کو لگتا تھا کہ خوامخواہ شوق ہی شوق میں یہ بچی نیا نکور برتن ٹیڑھا میڑھا بنا کر خراب کرے گی۔

”اماں صرف ایک بار اگر خراب ہوا تو پھر آئندہ نہیں ضد کروں گی۔“ اور پھر اس دس سالہ بچی نے چاک پہ چڑھے گیلے برتن کو ویسا سنبھالا۔ خوب صورت سی شکل کا برتن تیار ہو گیا اور خوش ہوتے ہوئے معمر سفالہ نے وہ پہلا

برتن جو صابرہ کے ہاتھوں میں مکمل ہوا تھا، اسے ہی انعام کے طور پہ مفت دے دیا، یہ آغاز تھا گیلی مٹی سے برتن بنانے کا۔

"سلام ابا۔" چارپائی پہ بیٹھی نوری بھی باپ کو آتا دیکھ کر دوپٹہ سنبھالتی اٹھ بیٹھی تھی۔

"او جا تو دی کو اس کے ساتھ دو ہاتھ لگا دے، ناشتہ ہی فوراً جھٹی مل جائے گا۔" اکبر علی ایسا ہی تھا بے صبرا سا۔ بھوک کا تو وہ بہت ہی ہلکا تھا۔ بھوک میں تو اس کی ایسی حالت ہوتی تھی کہ یہاں کہے اور وہاں کھانا سامنے آجائے، سلام کا جواب بیٹی کو دینے کے بجائے، کرختگی اور جھلاہٹ میں لپٹی تھی۔ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ نوری بھی ماں کے پیچھے ہی لپکی تھی۔

"پتا بھی ہے یہ میرا ناشتے کا وقت ہوتا ہے پھر بھی اور سیاپے لے کر بیٹھی ہوتی ہے۔" بھوک کے معاملے میں اس نے باپ کو ہمیشہ ایسا ہی دیکھا تھا۔ غصے میں اکبر علی کی برداشت ختم ہورہی تھی۔

"او جھٹی لے آ ناشتہ، جب روح پنڈے سے نکل جائے گی فیر ملے گا اج ناشتہ۔" باپ کی پکاریں سن کر شتی انداز میں ماں کے ساتھ ناشتہ تیار کرکے سامنے رکھا تو اکبر علی کو کچھ سکون آیا۔

"اور لسی؟" اور پھر لسی نہ ہونے پہ کوئی دو درجن جھڑکیاں دوپہر کے کھانے تک صابرہ کو سننے کو ملی تھیں۔

☆......☆......☆

دوپہر کے لیے ہانڈی چولہے پہ چڑھائی، روٹیوں کے لیے آٹا گوندھ کر مٹی کی پرائی میں رکھ کر اوپر سے ململ کے سفید اجلے کپڑے سے ڈھانپا...... چھاچھ مٹکی بھر کر رکھی، مرغیوں کے ڈربے کو کھول کر ان بے زبانوں کو دانہ پانی دینے کے بعد صابرہ نے چاک کے پاس پڑی چوکی سنبھال لی تھی۔ اب ساتھ ہی ساتھ کھانے کی نگرانی بھی کرنی تھی اور چاک پہ چڑھا نیا نکور برتن بھی سنبھالنا تھا۔ اسے اکبر علی کے آنے سے پہلے دوپہر کا کھانا بھی تیار کرنا تھا ہر صورت اور اس دوران کم از کم دو سے چار برتن بھی بنانے ہوتے تھے۔

یہ مٹی کے برتن ہی تو تھے اس کا ذریعہ روزگار...... اب وہ اپنے قصبے کی مشہور سنالہ تھی۔ جس کے ہاتھ کا بنا مٹی کا برتن ستھرا بھی ہوتا تھا اور مضبوط بھی اور دام بھی بازار کی نسبت مناسب ہوتے تھے۔ ضرورت نے اسے سنالہ بنا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اجازت ملی تھی اکبر علی سے اس کام کی۔ ساس، سسر، اکبر علی کوئی بھی اس حق میں نہ تھا کہ صابرہ برتن بنانے کا کام شروع کرے۔

"نا تجھے کیا لوڑ ہے یہ نیا سیاپا شروع کرنے کی؟" ساس کی طرف سے پہلی مخالفت ہوئی تھی۔

"اور کڑے گھر کے کم کاج کٹ ہوتے ہیں جو یہ تو نوا بکھیڑا ڈالنا چاہندی اے۔" سسر بھی بالکل حامی نہ تھے۔

"نا ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے جو تو سارا گھر مٹی، مٹی کرنا چاہندی اے۔" اکبر علی تو سب سے بڑا مخالف تھا اس کام کا، اسے تو جیسے صابرہ کی مخالفت کرکے دلی سکون ملا کرتا تھا۔

"کچھ پیسے ہاتھ آ جایا کریں گے۔ کچھ کام ہی سیدھے ہوجایا کریں گے۔" بڑی منتیں، ترلوں کے بعد وہ ان سب کو قائل کر پائی تھی اور شاید وہ تنہا سب کو قائل نہ کر پاتی اگر اس کا دیور اور دیورانی اس کی حمایت نہ کرتے۔

"چار پیسے ہی کار (گھر) آجایا کریں گے اکبر پائی (بھائی)" پھر کہیں جا کر صابرہ کو اجازت ملی تھی اور پہلی کمائی جو کہ ڈیڑھ ہزار تھی، اکبر علی کے ہاتھ پہ رکھی تو پھر اس کی جان بخشی ہوئی تھی۔

"چل کرے اے کم، پر گھر کے کام کاج (کام کاج) میں کوئی غفلت نہ ہو۔" یہ گویا دھمکی تھی اکبر علی کی۔

فضا میں آلو گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔ صابرہ نے آج گوشت پکایا تھا، وہ بھی نوری کی فرمائش پہ۔ اکبر علی آج گھر جلدی ہی لوٹ آیا تھا۔ پتا نہیں بھوک جلدی لگ گئی تھی یا پھر کچھ کرنے کے لیے کام نہیں تھا۔

"او کھانا تیار ہوگیا ہے کہ نئی؟" آتے ہی اکبر علی نے جیسے شور ڈال دیا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے کوئی دو گھنٹہ پہلے ہی گھر آ گیا تھا مگر ذہن میں یہی تھا کہ جب واپسی ہو کھانا



تیار ہو، ایک گھڑی کا بھی انتظار نہ کرنا پڑے۔

"وہ جی نوری کے ابا ابھی تو ہانڈی چڑھائی تھی۔" کافی دیر سے چڑھی چولہے پہ ہانڈی میں گوشت ابھی مکمل طور پہ گلا نہیں تھا کہ اکبر علی کے سامنے رکھ دیا جاتا۔

"او رتم لوگ ویلی گھر میں کرتی کیا رہتی ہو؟" اکبر علی کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ بس پھر بوکھلاہٹ کے نرغے میں گھبرائی صابرہ سے وہی کچھ ہوا جو روز ہوتا تھا، چاک پہ چڑھا برتن جو کہ ابھی آدھا تیار ہوا تھا ٹوٹا اور بکھر گیا۔ اب اکبر علی کے غصے کی زد میں تھی صابرہ اور نوری...... نوری جو کہ ابھی دو دن پہلے ہی سسرال سے آئی تھی۔

"کھانا بھی ٹیم (ٹائم) پہ تم لوگوں سے تیار نہیں ہوتا۔" صبح ناشتے کی طرح پھر سے صابرہ اور نوری کی دوڑیں لگ گئی تھیں۔ کسی نے ہانڈی سنبھال لی اور کسی نے روٹیوں کے لیے توا گرم کرنا شروع کردیا تھا۔ اب دو گھنٹے تک تو چاک نے بھی اکبر علی کی موجودگی میں خاموش ہی رہنا تھا۔

"او بات کی تو نے اپنے پرا (بھائی) طفیل سے؟" اکبر علی کے کاموں سے فارغ ہوتے ہی صابرہ نے پھر سے چاک پہ نیا برتن چڑھایا تھا کچھ دیر پہلے ٹوٹ کے بکھرے برتن کو سمیٹتے اسے کتنی دلی تکلیف ہوئی تھی یہ وہ ہی جانتی تھی پر یہ تو روز کا معمول تھا، روز ہی ایک دو برتن اکبر علی کی ڈانٹ پھٹکار سے ٹوٹ ہی جایا کرتے تھے۔ صابرہ کے مٹی میں لتھڑے ہاتھوں کے درمیان گیلا برتن "بدمست دے خود" ہوکر گھوم رہا تھا۔ آج کے دن اکبر علی کے جلد گھر آ جانے کی وجہ سے صابرہ کچھ زیادہ کام نہیں کر پائی تھی۔ ورنہ اس وقت تو وہ کوئی درجن کے قریب برتن بنا کر دھوپ میں خشک ہونے کے لیے بھی رکھ دیا کرتی تھی۔

"وہ جی......" صابرہ جواب دیتے کچھ گھبراہٹ کا شکار نظر آئی تو ماں کی گھبراہٹ چارپائی پہ سامنے بیٹھی نوری کی آنکھوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

"ابھی نہیں۔" خشک ہونٹوں کو تر کرتے، دونوں ہاتھوں کے درمیان برتن کو سنبھالتے، صابرہ نے جواب بنا اکبر علی کی طرف دیکھے دیا تھا، اس کے چہرے پہ گھبراہٹ کے ساتھ پریشانی کا رنگ بھی اتر آیا تھا۔

"وجہ......؟" کرخت آواز، غصیلا لہجہ اکبر علی جو کہ پرسکون سا چارپائی پہ ٹیک لگائے حقے کے کش لگا رہا تھا ایک دم سے غضب ناک ہوتے ذرا سیدھا ہوکر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی دستک نے عین بیچ میں مداخلت کرکے بات کا رخ کچھ دیر کے لیے موڑ دیا تھا۔ خریدار آئے تھے برتن لینے، صابرہ کے اشارے پہ نوری نے ہر ایک کو اس کی مطلوبہ شے پکڑوائی اور پانچ سو کے چار نوٹ گن کے اپنے دھیان میں جو ماں کو پکڑانے اس کی جانب بڑھی ہی تھی کہ اکبر علی کی کرخت آواز نے قدموں کو روک لیا۔

"اے مینوں پکڑا۔" بے بسی سے نوری نے ماں کو دیکھا اور صابرہ نے سرد آہ بھرتے نظریں جھکاتے اثبات میں سر کو ہلاتے بیٹی کو اشارہ کیا کہ پکڑا یہ رقم باپ کو۔ ماں کے وجود پہ چھائی بے بسی دیکھ کر نوری کا دل تڑپ اٹھا تھا مگر خاموشی کے ساتھ پیسے اکبر علی کے ہاتھ پہ رکھ دیے تھے۔ نوری جانتی تھی ذرا سا احتجاج بھی اس کا ماں کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ توڑ پھوڑ، گالم گلوچ اور رات گئے تک نہ ختم ہونے والا ہنگامہ۔

"ہاں بتا کیا تکلیف ہے جو ابھی تک تو نے گل (بات) اپنے پرا (بھائی) سے نہیں کی؟" پیسے گن کر وہ اپنی قمیص کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ اب پھر سے سارا دھیان اس کی اسی بات کی طرف تھا جو گاہکوں کے آنے سے ادھوری رہ گئی تھی۔

"نوری کے ابا مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ بھائی طفیل سے کیسے بات کروں؟" اٹکتے ہوئے صابرہ نے بہ مشکل اپنی الجھن بیان کی ہی تھی کہ صحن میں جیسے بھونچال سا آ گیا، گالم گلوچ، طعنے تشنے اور مزید طوفان مچاتے اکبر علی نے دو چار صراحیاں، مٹکے اٹھا کر غصے میں زمین پہ پٹخ ڈالے تھے اور پھر خود منہ سے کف اڑاتا، بک بک، جھک جھک کرتا باہر نکل گیا اور پیچھے رہ گئیں ہچکیاں اور سسکیاں۔

☆......☆......☆

صابرہ کا بڑا بھائی طفیل جو کہ کافی خوشحال تھا۔ وہ بیلوں کی جوڑی بیچ رہا تھا۔ معاشی حالات کی تنگی کا شکار اکبر علی

جو کہ آج کل کام کی وجہ سے بہت پریشان تھا، اس کی خواہش تھی کہ صابرہ اپنے بھائی سے بیلوں کی جوڑی مانگ لے اکبر علی کو کافی عرصے سے ہل چلانے کے لیے بیل کی ضرورت تھی۔ اپنے پاس تو اس کے اتنے پیسے تھے نہیں کہ ذاتی بیل خرید لیتا جب سے یہ خبر اکبر علی نے سنی تھی کہ وہ بیل بیچ رہا ہے، اسی روز سے وہ صابرہ کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ ہر صورت بھائی سے بیل مانگ کر لائے۔

"کیسے مانگوں طفیل بھائی سے بیلوں کی جوڑی؟" ٹوٹے ہوئے مٹکے اور صراحیوں کے ٹکڑے اٹھاتے صابرہ کی آنکھیں گیلی تھیں۔ کتنی محنت سے دھوپ میں اپنا آپ جلا کر اس نے یہ صراحیاں اور مٹکے بنائے تھے۔ دو سے تین ہزار تک کی تو خریدار سے بات بھی ہوگئی تھی، اکبر علی نے انہیں غصے میں توڑ کر دو تین ہزار کا بھی نقصان کر دیا تھا۔ صابرہ کا دل ٹکڑے سمیٹتے بے حد بوجھل سا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے توڑ کر یا پھر بکھیر کر رکھ دیا تھا اور اب وہ خود اپنا آپ سمیٹ رہی تھی...... ماں کا دل بوجھل محسوس کر کے نوری کا دل بھی بوجھل سا ہونے لگا تھا۔ وہ جو اپنی کسی الجھن کو سلجھانے ماں کی طرف کچھ روز کے لیے آئی تھی، ماں کو پریشانی میں گھرا دیکھ کر اپنا آپ ہی بھول گئی تھی۔

نوری نے بچپن سے ہی باپ کو ہمیشہ ایسا ہی دیکھا تھا، غصے کا تیز، جذباتی، بس اپنی چلانے والا اور کسی کی کچھ نہ سننے والا جب کہ ماں اس سے بالکل مختلف تھی، جیسے دھوپ کے مقابلے میں چھاؤں، آگ کے سامنے پانی۔

☆......☆......☆

"زرینہ بھابی تو ابھی تک ٹریکٹر پہ باتیں سناتی ہیں۔" چار سال پہلے بھی اکبر علی کے کہنے پہ صابرہ نے بھائی سے اس کا پرانا ٹریکٹر مانگا تھا جو کہ طفیل تو بیچنا چاہتا تھا مگر بہن نے اپنی پریشانی کا بتایا تو بھائی نے اس کی پریشانی دیکھتے یونہی دے دیا تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد زرینہ بھابی کوئی نہ کوئی بات صابرہ کو اب بھی کہہ دیتی تھیں۔

"سنا ہے بڑی اچھی قیمت کا ٹریکٹر بیچا ہے اکبر علی نے؟" بظاہر مسکراتے مگر انداز زرینہ کا زہریلا سا ہوتا تھا۔

"ویسے کتنے پیسے ملے تھے ٹریکٹر کے؟" یہاں سسرال میں اکبر علی کی گالیاں اور وہاں میکے میں زرینہ بھابی کے طعنے صابرہ تو جیسے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ گئی تھی۔ ٹریکٹر والا معاملہ تو سارا نوری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ بھلے اس وقت چھوٹی تھی، ہر بات کو اتنی گہرائی سے نہیں سمجھ سکتی تھی مگر یہ ابھی تک اسے یاد تھا کہ ٹریکٹر کو لے کر ساس، سسر اور اکبر علی تو صابرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے بلکہ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ اکبر علی نے باپ کے کہنے پہ طلاق تک کی دھمکی دے دی تھی۔

"بھائی سے ٹریکٹر مانگ کر لائے ورنہ میری طرف سے طلاق ہے۔" اور ساس کے تو اٹھتے بیٹھتے طعنے ہی نہیں ختم ہونے کو آتے تھے۔

"تو کی تے رج کا جہیز بھی نہ لائی، چل اب پرا (بھائی) سے ٹریکٹر ہی مانگ کر وہ کسر پوری کر دے۔"

اس پورے عرصے میں نوری نے ماں کو تنہائیوں میں بے تحاشہ بس روتے ہی دیکھا تھا اور پھر صابرہ نے بھائی سے بڑی منتوں کے بعد وہ ٹریکٹر مانگ کر "کسر" پوری کی تھی جو جہیز کم لانے پہ ہوتی تھی، اب بیلوں کی جوڑی کا عذاب صابرہ کی جان پہ آ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے اکبر علی کی گالیاں سننے کو مل رہی تھیں۔

بیلوں کی جوڑی کو لے کر اکبر علی نے گھر میدان جنگ بنا دیا تھا۔ اک بار پھر سے سب افراد خانہ صابرہ کے خلاف ہو گئے تھے، اس بار تو دیور، دیورانی نے بھی صابرہ پہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ بھائی سے ہر صورت بیل کی جوڑی مانگے اور جبکہ اس بار "شرم کی ماری" صابرہ مانگنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

"بھلا آسان ہوتا ہے ہاتھ پھیلانا؟" صابرہ کو اپنا آپ بھکاریوں سا لگ رہا تھا۔

طفیل بھائی خود بھی بہن کا ہمیشہ بہت خیال رکھتے تھے، کبھی گندم کی دو بوریاں تو کبھی چاول کی بوری بہن کے گھر بھجوا دیا کرتے تھے۔ صابرہ کا بھائی جانتا تھا کہ بہن کو سسرال میں خوش حالی میسر نہیں ہے اور جب سے بھائی



نے دیکھا تھا کہ بہن نے اپنے خرچوں کے لیے مٹی کے برتن بنا کر بیچنا شروع کر دیئے تھے، اسے بہت رنج ہوا تھا۔ جبکہ زرینہ بھابی کو یہ سب برا لگا کرتا تھا۔ چیز پکڑاتے ہوئے وہ کوئی نہ کوئی بات کہنا نہ بھولتی تھیں۔ صابرہ کو شرمندہ کر کے جیسے وہ کوئی بڑا "قرض" ادا کرتی تھیں۔ اب ایسے حالات میں بیلوں کی جوڑی مانگنا...... صابرہ کو اس پریشانی نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

☆......☆......☆

پہلے جوانی تھی تو اکبر علی کے پاس ایسا ہتھیار تھا کہ جوان بہن کو طلاق کی دھمکی دے کر بھائی کے گھر بھیجا جاتا اور مطالبہ پورا کروا لیا تھا۔ اب اس عمر میں عورت پہ دباؤ ڈالنے کے لیے اور اپنا مطالبہ منوانے کے لیے مرد کے پاس کئی حربے ہوتے ہیں اور اکبر علی کے پاس اس عمر کے سارے ہتھیار تھے۔

"لے جا میرے سامنے سے کھانا۔" غصے میں اکبر علی ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا، انتہا کو چھوتا ہوا بلکہ وہ غصے کا اتنا خراب تھا کہ کہنے والے کہتے تھے اکبر علی کے غصے میں پاؤں زمین پہ ہوتے ہیں مگر دماغ آسمان پہ۔ یہ اکبر علی کے مزاج کی تیزی ہی تو تھی جس نے صابرہ کو اور صبر کرنے والا بنا دیا تھا۔ گھر اور اولاد کی وجہ سے صابرہ صبر پہ مجبور رہی تھی۔

"ایک سخت ہو تو گھر کی خاطر دوسرے کو نرم ہی رہنا پڑتا ہے کبھی موم جیسا نرم، کبھی روئی جیسا نرم، تو کبھی گیلی مٹی جیسا نرم۔"

صابرہ نم آنکھیں لیے اکبر علی کے سامنے سے ہٹ تو جاتی مگر خود پہ فرض سارے کام جو کہ مجازی خدا کے تھے اپنے ہاتھ سے ہی انجام دیا کرتی تھی، اکبر علی کا تین وقت کھانا خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتی، اس کے کپڑے دھوتی، اس کا حقہ خود سے تیار کر کے اس کے چارپائی کے پاس رکھ دیتی مگر خود سامنے نہ آتی تھی۔

"تیرا بندہ غصے کا تیز ہے، فیر وی بار بار سامنے آ کر اس کا مغز ضرور گرم کرنا ہے۔" یہ ساس کی پھٹکار ہوا کرتی تھی جو بد دماغ بیٹے کے مقابلے میں ہمیشہ بہو کے حصے میں آیا کرتی تھی۔

"تم زنانیاں (عورتیں) بھی عجیب ہوتی ہو، پہلے اپنے بندے کا دماغ گرم کرنا، فیر بار بار اپنی "بوتھی" (چہرہ) بھی لے کر اس کے سامنے آ کر اس کا دماغ اور گرم کر دینا۔"

ساس عورت ہو کر خود اتنی گرم مزاج تھی، یا نمی کی بخشی ہوئی گرمی تو تھی جو بیٹے میں جوش مار رہی تھی۔ سارے کام خاموشی سے نمٹا کر وہ چاک سنبھال لیا کرتی تھی مگر اس دوران بھی ان آنکھوں کا گیلا پن دور نہ ہو پاتا تھا۔ صحن کی فضا میں سوندھی سوندھی خوشبو شامل ہونے کو ہی ہوتی کہ اکبر علی غصے میں کھول اٹھتا، گالیاں، طعنے اور جو منہ میں آتا کہتا چلا جاتا اور صابرہ کا کام ہوتا صرف سننا سر جھکا کر سننا یا پھر آنسو بہا کر سننا۔

"یعنی ہر حال میں صرف سننا۔"

پھر بھی اکبر علی کا بھانبڑ قابو سے باہر ہوتا تو طیش میں آ کر دو چار ہانڈیاں، صراحیاں، مٹکے توڑ کر اپنا غصہ صابرہ پہ نکالا کرتا۔ صابرہ ایسی صورت حال میں سر جھکائے گرم آنسوؤں کو دوپٹے میں جذب کرتی یا خاموشی سے مٹی کے برتن بناتی رہتی۔ اکبر علی کو اس کے دونوں کام ہی کوئلے کی طرح دہکا دیتے تھے۔

ایک خاموشی اور دوسرا مٹی کے برتن بناتے رہنا۔

اکبر علی کے مطابق یہ صابرہ کی ڈھٹائی کا اظہار تھا، جو وہ ڈھیٹ بن کر مقابل آ گئی ہے کیا اکبر علی کا مطالبہ لے کر بھائی کے پاس نہیں جا رہی۔

"ایس کوئی ڈھیٹ عورت میرے پلے باندھ دی ہے کہ دل چاہتا ہے......" غصے میں سانڈ بنا اکبر علی کیلے برتنوں کو توڑ کر تسکین حاصل کرتا جو صابرہ نے خشک ہونے کے لیے دھوپ میں رکھے ہوئے تھے۔

آج سورج کی تمازت روز کی نسبت کچھ کم تھی۔ ایسے موسم میں صابرہ برتن کم تعداد میں بناتی تھی۔ جو پہلے برتن بنا کر رکھے تھے وہ ابھی تک پوری طرح خشک نہ ہوئے تھے تو مزید پھیلاوا کیوں کرتی بس آج اس نے دو چار ہی برتن بنائے تھے اور باقی کے ماں کے کہنے پر نوری نے احتیاط و ترتیب سے

دھوپ میں خشک ہونے کے لیے رکھ دیئے تھے۔

"اماں کیسے سہہ لیتی ہو یہ سب؟" نوری نے بچپن سے ہی ماں کی آنکھوں اور دوپٹے کو گیلا دیکھا تھا، برتن بناتے وہ اکثر صرف چپکے چپکے آنسو بہا رہی ہوتی تھی، اس وقت نوری چھوٹی تھی نا سمجھ تھی، ماں کی کیفیت، دکھ درد کی وجہ سے بستر پہ پڑے مریض جیسی ہو جاتی تھی، نوری کچھ زیادہ ٹھیک سے سمجھ تو نہ پائی تھی مگر جب جوان ہوئی تو بہت سی نا سمجھ آنے والی باتیں سمجھنے لگی تھی۔ اور جب بیاہ کر نوری سسرال گئی تو چپکے چپکے تنہائیوں میں آنسو بہانے کی ایک عورت کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

"ایک عورت کی آنکھوں کی طغیانی جیسے ان میں ستلج، چناب، راوی اتر گئے ہوں، نوری اس طغیانی کی وجہ اچھی طرح جان گئی تھی۔"

"میری دھی عورت کا تو کام ہی سہنا ہے۔" دھیرے سے مسکراتے ایک سرسری سی نگاہ نوری کے چہرے پہ ڈالنے کے بعد صابرہ کی نظروں کا رخ اس مٹکے کی طرف ہو گیا تھا جو چاک پہ چڑھا اس کے مٹی میں لتھڑے ہاتھوں کے درمیان گھوم رہا تھا، کتنے دنوں بعد نوری نے ماں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا، کتنے دنوں بعد اس نے صابرہ کے چہرے پہ اطمینان بکھرا دیکھا تھا۔ اس سکون و اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ طفیل بھائی سے بیلوں کی جوڑی مانگنے والا معاملہ خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ بیل بیمار ہوئے اور ایک ہفتے علاج کروایا، دوا اور غلط ٹیکہ لگانے کی وجہ سے وہ دونوں مر گئے تھے، صابرہ کی جیسے طفیل بھائی اور زرینہ بھابی سے بیلوں کی جوڑی مانگنے کی وجہ سے جو ذلت اور بے عزتی ہوئی تھی اس سے جان بچ گئی تھی۔ وہ ایک الگ بات تھی کہ بیلوں کے مرجانے پہ اکبر علی کے ہاتھوں صابرہ کی شامت پھر بھی آئی تھی۔

"کسی اس منحوس عورت نے نحوست ڈالی کہ بیل ہی مر گئے۔ یہاں بھی غلطی عورت کی تھی کہ وہ "منحوس" بھی تھی اور "کالی زبان" والی بھی۔

"چلو چنگا ہویا، مجھے نہیں ملی، تو تیرے ویر کے بھی کسی کم (کام) نہ رہی۔" دل کا کڑوا اکبر علی جیسے اب اس بات سے سکون حاصل کر رہا تھا۔

"اماں مگر مجھے نہیں لگتا کہ میں تیری طرح یا اور عورتوں کی طرح حوصلے والی ہوں کہ یہ سب سہہ سکوں۔"

چاک پہ گھومتے بدمست و بے خود مٹکے پہ جمائی نوری کی آنکھیں ایک دم سے بھیگیں تو ساتھ ہی لہجہ بھی بھیگ گیا تھا۔ بیٹی کا لہجہ بھیگنے کی دیر تھی کہ ان دو گہری نہروں (آنکھوں) میں تیرتا درد اور غم ایک ماں کو بہت کچھ سمجھا گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر اور اندیشہ ایک ماں کے دل کو تھا۔ صابرہ کی نظریں اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان گھومتے گیلے مٹکے سے ہٹ کر نوری کے غمگین چہرے پہ جمیں تو ماں کا دل ڈوب سا گیا۔

☆......☆......☆

نوری اپنے شوہر مہر علی سے جھگڑ کر میکے آئی تھی، اس کی شادی کو ابھی سات ماہ ہوئے تھے، مہر علی، اکبر علی کا بھتیجا تھا۔ غصے کا تیز آتشی مزاج سا، بالکل اپنے تایا جیسا۔ مہر علی کے مزاج کی گرمی صابرہ کی لاڈلی اکلوتی بیٹی نوری کو جھلسا نہ دے، دبے لفظوں میں اس نے اکبر علی کے سامنے اس رشتے کی مخالفت کی تھی۔

"او بن اینا دی کوڑا نئی مہر علی زبان کا۔" اکبر علی نے تو ٹھان لی تھی کہ نوری کو مہر علی کے ساتھ ہی بیاہنا ہے اور یہ فیصلہ پتھر پہ لکیر ہو گیا تھا اور اس لکیر کو مٹانا صابرہ جیسی کمزور عورت کے بس کی بات بھلا کہاں تھی۔

"بندے کا مغز ہمیشہ تب ہی خراب ہوتا ہے جب عورت زبان تڑتڑ چلاتی ہے۔" اکبر علی کی یہ بات سن کر صابرہ گہری سوچ میں ڈوب جایا کرتی تھی۔ اس نے بھلا کب زبان تڑتڑ چلائی تھی۔ وہ تو ہمیشہ اکبر علی کے سامنے یوں رہی تھی کہ جیسے منہ میں زبان نہ ہو یا پھر صابرہ گونگی پیدا ہوئی تھی پھر بھی اکبر علی کا دماغ ہمیشہ غصے میں خراب ہی دیکھا تھا۔

اکبر علی کے فیصلے کا سن کر صابرہ نے لب سی لیے تھے اور اپنی دلی رائے کو کسی گہرے کنویں میں پھینک کر دل پہ صبر کا



پتھر رکھ لیا تھا۔ نصیب سے تو صابرہ نہیں لڑ سکتی تھی اور نوری کے نصیب میں مہر علی لکھ دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

چھوٹے موٹے جھگڑے تو معمول کی بات تھی مگر اس بار نوری اور مہر علی میں ناراضگی کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اکڑ گیا تھا، نوری بھی ضد میں آ گئی تھی اور جھگڑا اتنا بڑھا کہ نوری نے دو چار جوڑے اپنے کپڑے اور خود ہی تانگے میں بیٹھ کر میکے آ گئی تھی۔ دل میں تو تھا کہ خوب رو رو کے ماں کی سینے سے لگ کر مہر علی کی شکایتیں کرے گی، اس کی بد زبانی اور بدلحاظی کا واویلا باپ کے سامنے کرے گی، وہ بتائے گی کہ اس بار مہر علی نے اس پہ ہاتھ بھی اٹھایا ہے مگر یہاں آئی تو ماں کی حالت دیکھ کر زبان پہ تالا لگا لیا تھا۔ وہ تو خود اس کے باپ کے ہاتھوں درگت بنوا رہی تھیں، نوری نے دکھ کو دل میں رکھ کر زبان کو تو چپ رہنے کا کہہ دیا مگر آنکھیں اس کا حکم نہ مان پائیں۔ چپکے چپکے تنہائی میں بہنے لگی تھیں۔

"نہ رو میری دھی۔" صابرہ بیٹی کی آنکھ میں آنسو نہ سہہ پائی۔ عورت جس میں بہت کچھ سہہ لینے کی ہمت و برداشت ہوتی ہے۔ اولاد کی تکلیف سہنا اس کی برداشت سے زیادہ ہوتا ہے۔ سینے سے لپٹائے صابرہ کچھ دیر نوری کو سسکتی دیکھتی رہی، اس کا غم اپنے سینے میں اتارتی رہی تھی۔

فضا بھی خاموش تھی، چاک بھی خاموش ہو چکا تھا، بس فضا میں پھیلی ہوئی تھی گیلی مٹی کی مہک تھی۔

"مرد سے ٹکرا کر عورت کو بھلا ملتا ہی کیا ہے؟" لہجہ بھیگا، الفاظ بھی بھیگے ہوئے تھے۔

"بالکل گیلی مٹی کی طرح۔" صابرہ کو اندازہ تھا کہ بیٹی کی حمایت میں دو لفظ بھی کہنے کے لیے زبان اکبر علی کے سامنے کھولی تو قیامت آ جائے گی، حشر برپا ہو جائے گا، حساب و کتاب شروع ہو جائے گا اور پھر صابرہ کے حصے میں کیا آئے گا صرف سزا ہی سزا۔

"سزا کی تو بات ہی نہ کرو۔" سینے سے لگی نوری رو رہی تھی۔

"مرد سے ٹکرا کر عورت ٹوٹ جاتی ہے یا پھر بکھر جاتی ہے۔" نرمی سے بیٹی کی پشت پہ ہاتھ پھیرتی صابرہ خود بھی ضبط کے کڑے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔

"تو پھر کیا کروں اماں؟" آنسو تھے کہ نوری کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"گیلی مٹی کی طرح ہو جا میری دھی۔" دونوں ہاتھوں میں نوری کا آنسو سے بھیگا چہرہ لیے صابرہ کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور گہرا ہوا اور اس کی کہی بات بھی اتنی گہری تھی کہ نا سمجھی نوری کے چہرے پہ آنسوؤں کے ساتھ دکھائی دینے لگی تھی۔ آنسوؤں کو پونچھتے حیران سی نوری، ماں کی گیلی آنکھوں کو تکنے لگی تھی۔

"گیلی مٹی..."

"عورت نہ خشک مٹی کی طرح ہو کہ بکھر جائے...... نہ ہی سخت مٹی کی طرح کہ ٹوٹ جائے، اسے تو گیلی مٹی کی طرح ہونا چاہیے جو ہر طرح کی صورت حال میں ڈھل جائے۔"

اس لمحے نوری کو اپنا وجود صابرہ کے مٹی میں لتھڑے ہاتھوں کے درمیان چاک پہ چڑھے دیوانہ وار گھومتے مٹی کے گیلے برتن کی مانند لگنے لگا تھا جس کو جس شکل میں ڈھالتے جاؤ، وہ ڈھلتا جائے۔

"اپنے گھر کی خاطر گیلی مٹی کی طرح ہو جا ورنہ ٹوٹ جائے گی یا بکھر جائے گی میری دھی۔"

فضا میں پھر سے گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو شامل ہو گئی تھی۔ چاک پھر سے گھومنے لگا تھا، صابرہ نے اس پہ نیا برتن بنانے کے لیے چڑھایا اور اس بار چاک پہ چڑھا یہ برتن نوری کو اپنا وجود لگنے لگا تھا۔ بالکل گیلی مٹی سا وجود۔

## خلفائے راشدین
# حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

اس کے بعد عمرؓ نے فرمایا۔
اللہ کی قسم! مرتدین سے قتال کرنے میں ابوبکرؓ کا ایمان پوری امت کے ایمان پر بھاری ہے۔
جو لوگ زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں جبکہ حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے فرمایا۔
ترجمہ: کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی ہو قیامت کے دن سخت عذاب کی مار اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔ (البقرہ)

### وفود کی آمد

جو قبائل زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے تھے انہوں نے ابوبکرؓ کی طرف وفود بھیجنے شروع کر دیئے تاکہ آپ کو زکوٰۃ نہ وصول کرنے پر مطمئن کر سکیں لیکن آپ اپنے موقف سے انچ بھر بھی نہ ہلے آپ کا پختہ عزم دیکھ کر وفود مدینہ سے واپس چلے گئے۔ انہیں دو باتیں اس قدر مضطرب کر رہی تھیں کہ وہ بار بار ان کا ذکر کرتے۔ پہلی بات یہ کہ اس سلسلے میں وفد کا آنا اور گفتگو کا مرحلہ کیونکہ خلیفہ کی اپنی رائے اور عزم سے پیچھے ہٹنے کی کوئی امید نہیں جبکہ مسلمان فوجوں دلائل کے ساتھ جواب آنے کے بعد آپ سے متفق ہو چکے ہیں اور آپ کی تائید کے لیے وہ کرتے رہیں۔
دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کی کمزوری اور قلت تعداد کو غنیمت جانتے ہوئے مدینہ پر ایسا زوردار حملہ کیا جائے کہ اسلامی حکومت کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو جائے اور اس دین کا خاتمہ ہو جائے۔
ابوبکرؓ نے یہ گفتگو کے دوران ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ لوگ مکمل طور پر مرتد ہو چکے ہیں۔ یعنی کافر ہیں ان کے وفود نے ہماری قلت کا اندازہ بھی لگا لیا ہے وہ کسی وقت بھی مدینہ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ "بریذ" مقام مدینہ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر بہت قریب پڑتا تھا جس سے خطرہ لاحق تھا۔
ابوبکرؓ نے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے مندرجہ ذیل منصوبہ بندی بنائی۔
(۱) اہل مدینہ پر لازم قرار دیا کہ وہ مسجد میں ہی رات گزاریں تاکہ دفاع کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔
(۲) مدینہ کے مختلف رستوں پر حفاظتی دستے بٹھائے گئے ان کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ وہیں رات گزاریں اور حملے کے وقت مدینہ کا دفاع کریں۔
(۳) حفاظتی دستوں میں امراء مقرر کیے علی بن ابی طالب زبیر بن عوام طلحہ بن عبداللہ سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن بن عوف عبداللہ بن مسعود ان دستوں کے امراء تھے۔
(۴) مدینہ کے اردگرد بسنے والے قبائل جو کہ اسلام پر قائم تھے جیسے اسلم غفار مزینہ اشجع جہینہ کعب ابوبکرؓ نے سب کو خط لکھ کر مرتدین سے جہاد کا حکم پہنچایا۔ سب نے آپ کی حکم کو قبول کیا اور مدینہ میں ان سے چہل پہل ہو گئی ان لوگوں کے ساتھ اونٹ گھوڑے بھی تھے جو انہوں نے ابوبکرؓ کے حوالے کر دیئے۔ اس غیر معمولی امداد نے سب کے حوصلے خوب بلند کیے صرف جہینہ نے ہی چار سو اونٹوں اور گھوڑوں کو ابوبکرؓ کی طرف روانہ کیا تھا۔ عمرو بن امیہ جہنی نے سو اونٹ مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجے دوسرے قبائل نے بھی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق مسلمانوں کی مدد فرمائی ابوبکرؓ نے تمام اونٹ اور گھوڑے لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔
(۵) مدینہ سے دور رہنے والے مرتدین سے ابوبکرؓ نے خطوط کے ذریعے سے جنگ کی اور ان سے خطرہ کم ہو گیا پھر آپ نے مسلم امراء اور والیان کو مختلف علاقوں میں خطوط لکھ کر انہیں مرتدین سے قتال کرنے کے لیے ابھارا



یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کا تھا جو ابوبکرؓ نے اپنایا۔

### اہل یمن کو خط

یمن میں اسود عنسی کی ساتھ مرتدین کا لشکر موجود ہونا مسلمانوں کے لیے خطرہ سے خالی نہ تھا آپ نے اہل یمن کو خط لکھا... "لہٰذا ابنائے فارس کی ان کے مخالفین کے خلاف مدد کرو اور ان کا مکمل ساتھ دو...... اور فیروز کی بات ماننا بے حد ضروری ہے۔ تم ان کی کوشش میں شریک رہو کیونکہ میں نے اس کو وہاں کا والی مقرر کیا ہے۔
اس خط کا نتیجہ بہت اچھا اور قابل تسکین نکلا کہ وہاں کے مسلمان نوجوان فیروز کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے عرب نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دونوں نے مل کر مرتدین پر ایسا اچانک تیز حملہ کیا کہ ان کی تمام سازشیں دھری کی دھری رہ گئیں جس کی وجہ سے یمن تھوڑے ہی عرصے میں مکمل طور پر اوقت پا گیا۔
(۶) مرتدین میں سے جو مدینہ کے قریب تھے ان کا خطرہ بڑھ چکا تھا جیسے بنو عبس اور بنو ذبیان مدینہ میں ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے آپ نے مرتدین کی غداری سے بچانے کے لیے خواتین اور بچوں کو قلعوں میں محفوظ کر لیا اور ان سے قتال کے لیے تیار ہو گئے۔

### ذوحسی پر ناکامی

جب مرتدین کے وفود ابوبکرؓ سے ملاقات کرنے کے بعد ناکام واپس لوٹے تو تین دن بعد بعض قبائل اسد غطفان عبس ذبیان اور بکر نے مدینہ پر رات کے اندھیرے میں چڑھائی کی اور کچھ لوگوں کو "ذوحسی" مقام میں چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کے لیے پشت پناہ رہیں...... جب مدینہ پر حفاظتی دستوں کو اس کا احساس ہوا تو انہوں نے ابوبکرؓ کو خبر بھیجی...... ابوبکرؓ نے انہیں حکم بھیجا کہ اپنے مقامات پر ڈٹے رہو...... وہ اپنی جگہ موجود ہے اور جو لوگ مسجد میں دفاع کی تیاری کے لیے بیٹھے تھے وہ اونٹوں پر سوار ہو کر ان کی طرف بڑھے۔ دشمن سرپٹ بھاگ پڑا مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ذوحسی تک پہنچ گئے...... وہاں مذکار مشکیزے لے کر نکلے جن میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ انہیں رسی سے باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے اونٹوں کے پاؤں میں پھیلا دیئے مسلمانوں کے اونٹ اپنے سواروں سمیت بدل اٹھے کیونکہ اونٹ مشکیزوں سے ہمیشہ بدک اٹھتے ہیں اونٹ جب قابو سے باہر ہو گئے تو سواروں نے مدینہ کی طرف رخ کیا لیکن کوئی مسلمان نہ سواری سے گرا اور نہ اس کو زخم آیا۔ (مسلمان غالب)
اس واقعے سے ان لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ مسلمان کمزور ہیں لیکن ابوبکرؓ پوری رات تیاری میں لگی رہے پھر تیاری کے بعد آپ رات کے آخری حصے میں نکلے۔
میمنہ پر نعمان بن مقرن!
میسرہ پر عبداللہ بن مقرن ساقہ پر سوید بن مقرن تھے
آپ کے ساتھ شہسوار بھی تھے۔
فجر طلوع ہوتے ہی اسلامی فوج اور دشمن کی فوج ایک ہی میدان میں جمع تھی۔ دشمن کو ان کی تیاری اور دفاع کا اندازہ تک نہ تھا جب میانوں سے تلواریں نکلیں اور چمکیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے رات گئے تک دونوں میں جنگ جاری رہی جونہی سورج نے کرنیں بکھیریں دشمن بھاگ پڑا...... مسلمان غالب آئے ان کی تمام سواریاں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں اس جنگ میں طلیحہ اسدی کا بھائی حبال قتل ہو گیا...... ابوبکرؓ نے دشمن کا پیچھا کیا اور لڑتے ہوئے ذوالقصہ پہنچ گئے یہ پہلی فتح تھی۔
وہاں نعمان بن مقرن کو کچھ لوگوں کے ساتھ چھوڑ کر خود مدینہ آ گئے بنو ذبیان اور عبس نے وہاں مسلمانوں پر دھاوا بول دیا آخر کار مسلمانوں کو ابوبکرؓ کے حملے سے اس طرح عزت و غلبہ نصیب ہوا کہ ابوبکرؓ نے قسم کھائی کہ ہر مقتول کے بدلے مشرکین سے میں ضرور قتل کروں گا اور جتنے مسلمان قبیلوں میں سے قتل ہوئے ہیں ان کے برابر اور ان سے زیادہ لوگوں کو قتل کروں گا۔
اس کے بعد ابوبکرؓ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ مسلم شہداء کا انتقام ضرور لیں گے۔
چنانچہ بہت جلد آپ نے اپنی قسم پوری کی اور دیگر قبائل میں مسلمانوں کی ثابت قدمی بڑھی اور مشرکین ذلت

ور سوئی ... میں ملوث ہو گئے۔
اس کے بعد قبائل کی زکوٰۃ مدینہ میں آنے لگی۔
پہلی رات صفوان کی!
دوسری شب زبرقان کی!
آخری شب میں عدی کی زکوٰۃ مدینہ پہنچ گئی۔
ایک ہی رات میں چھ قبائل کی زکوٰۃ مدینہ پہنچی۔
ابھی یہ زکوٰتیں اور خوشخبریوں کے ہمراہ اسامہ بن زید
اپنی فوج کے ساتھ فتح یابی کا مژدہ لے کر واپس مدینہ پہنچ
گئے آپ نے ان تمام مہمات کو طے کیا جن کا انہیں رسول
اللہﷺ نے حکم فرمایا تھا اور ابوبکرؓ نے وصیت کی تھی۔

مدینہ کا نائب!
ابوبکرؓ نے اسامہ بن زید کو ان کامیابیوں اور فتح یابی کی
خوشی میں مدینہ کا نائب مقرر کیا اور ان کو مدد فوج کے
مدینہ میں آرام کرنے اور سواریوں کو مکمل آرام پہنچانے کا حکم
صادر کر دیا اور خود اپنے لوگوں کے ساتھ ذوالقصہ کی طرف
روانہ ہو گئے آپ کو مسلمانوں نے روکنا چاہا۔
"اے خلیفہ رسول! آپ اپنے آپ کو خطرے میں
مت ڈالیں اگر آپ کے ساتھ کچھ ہو گیا تو پورا انتظام درہم
برہم ہو جائے گا۔ آپ کا اس وقت مدینہ میں رہنا دشمن
کے مقابلے میں نکلنے سے زیادہ ضروری ہے۔ کسی دوسرے
کو قائد بنا کر بھیج دیجیے۔"
آپ نے جواب دیا۔
واللہ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا میں آپ لوگوں کی
غمخواری اپنی جان سے کروں گا۔

**ابوبکرؓ کی قیادت**

ابوبکرؓ خود ذوحسی اور ذوالقصہ کی طرف روانہ ہو گئے اور
نعمان، عبداللہ اور سوید اپنے اپنے مقامات پر ٹھہرے
رہے۔ ابوبکرؓ مقام ابرق پر پہنچے اور ......؟؟ والوں پر حملہ
کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین میں سے حارث اور عوف
کو شکست دی اور حطیہ کو قید کر لیا گیا۔ بنو عبس اور بنو بکر
بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ روز ابوبکرؓ ابرق میں ٹھہرے اس
علاقے پر بنو ذبیان پہلے سے قابض تھے ابوبکرؓ نے فرمایا۔
بنو ذبیان اس علاقے کے مالک نہیں ہو سکتے کیونکہ
علاقہ اللہ تعالیٰ نے بطور غنیمت عطا کیا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ
کی مدد سے جب مرتدین مغلوب اور ابوبکرؓ غالب آ گئے تو
آپ نے سب کو معاف کر دیا لیکن بنو ثعلبہ کو وہاں دوبارہ
آباد ہونے سے آپ نے روک دیا تو وہ مدینہ میں آپ کی
خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ آپ ہمیں اپنے
علاقے میں آباد ہونے سے کیوں منع کر رہے ہیں۔
ابوبکرؓ نے فرمایا تم جھوٹ کہہ رہے ہو وہ تمہارا علاقہ
نہیں رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے اور ہم نے
جنگ لڑ کر دشمن سے حاصل کیا ہے۔ آپ نے ان کی
شرارتوں کو معاف نہ کیا اور اس علاقے کو ابرق کے
مسلمانوں کے گھوڑوں کے لیے چراگاہ بنا دیا۔
اور ربذہ کے باقی علاقے کو لوگوں کے لیے عام چراگاہ
قرار دے دیا۔
لیکن جب صدقات کے اونٹوں کے ذمہ داران اور
عام لوگوں کے درمیان لڑائی ہوئی تو آپ نے اس علاقے
کو صدقات کے اونٹوں کے لیے مقرر کر دیا۔
ابوبکرؓ کا مسلسل یکے بعد دیگرے تین بار جہاد کے لیے
نکلنا اور پھر یہ کہہ کر دوسروں کو مطمئن کرنا کہ میں اپنی جان
کے ذریعے تمہاری غمخواری کروں گا۔
آپ کے اس عمل سے جبکہ آپ کی عمر اس وقت ساٹھ
سال تھی اس کے باوجود آپ نے نہ دن آرام میں گزارا
اور نہ رات سو کر بسر کی.... بلکہ تین جہاد کی تھوڑے سے
وقت میں تیاری اور آپ کی قیادت نے صحابہ کرام کے
حوصلے بلند کر دیے اور دشمن کی قوت، جرات اور ہمت پست
ہو گئی۔







# بیاضِ دل

## میمونہ رومان

**حمیرا علی ..... کراچی**
تم نے دیکھی ہیں فقط میری ہنستی آنکھیں
تم نے دیکھا ہے کہاں آنکھ سے بہتا دل کا
مان جاتی ہوں مناتے ہو کسی بھی ڈھنگ سے
تم نے مانا ہے کبھی اس طرح کہنا دل کا

**مدیحہ نورین مہک ..... گجرات**
اداسی، شام، تنہائی، کسک یادوں کی بے چینی
مجھے سب سونپ کر سورج اتر جاتا ہے پانی میں

**پروین افضل شاہین ..... بہاولنگر**
آنگن میں تیرے آؤں کا میں چاندنی لیے
اس انتظار میں رات بھر جاگا تو مت کرو
کہتے ہیں لوگ مجھ سے تم ہو بھی بھی
یہ کیا غضب ہے عشق کو رسوا مت کرو

**ہالہ سلیم ..... کراچی**
کچھ لوگ میرے لفظوں سے سیتے ہیں اپنے زخم
کچھ لوگوں کو میں چبھتا ہوں اک نوک کی طرح

**شہزادی فرخندہ ..... خانیوال**
تیرا خیال ہے سانسوں جیسا
جو تو نہ آئے تو مر ہی جاؤں میں

**اسدی گجر ..... چکوال**
ویرانی چہرے کی بتا رہی ہے وہ نظارہ نہ ملا تم کو
کوشش کی ساحل پر آنے کی پر کنارہ نہ ملا تم کو
جس کی خاطر اسدی کو چھوڑا اس کا سہارا نہ ملا تم کو
آزما کے دیکھ لیا نہ مجھ جیسا شخص دوبارہ نہ ملا تم کو

**ثانیہ ابراہیم ..... ہری پور**
اب تیرا رونا کس کام کا
اب تو مر گئی وہ جو تم پہ مرتے تھے

**فوزیہ عمران ..... چکوال**
خود بخود چھوڑ گئے تو چلو ٹھیک ہوا
اتنے احباب کہاں ہم سے سنبھالے جاتے
ہم بھی غالب کی طرح کوچہ جاناں سے محسن
نہ نکلتے تو کسی روز نکالے جاتے

**فریحہ چوہدری ..... شاہ نکڈر**
اجڑ جائے سب کچھ تو بھی پروا نہیں مجھ کو
عزیز کچھ اس قدر ہے مجھ کو بے نیازی میری
الزام اور بھی ہے منسوب میری ذات سے ساحر
تجھ کو تو معلوم ہے بس زبان درازی میری

**ثمرہ گلزار ..... کوٹلی گجرات**
محبت تو عبادت جیسی ہوتی ہے ثمرہ
اسی بات سے تو ناواقف ہیں لوگ

**شگفتہ صدیقی ..... دیول، مری**
تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

**ملیزہ بھٹی ..... خیرپور**
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

**دانیہ عنبرین ..... کوہاٹ**
جذبے کی لو کو میرے جنوں نے چھوا تو ہے
اتنا ہوا وہ خواب میں آ کر ملا تو ہے
وہ دشمن کے ساتھ سہی دیکھا تو ہے
ہم مطمئن کہ اس سے کوئی رابطہ تو ہے

**سدرہ انجم ..... کراچی**
اس کی صورت کو جب سے دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں

**بنت کنول ..... قصور**
یا رب میری حیات کو ایسا کمال دے
ایسی بنوں میں کل کو زمانہ مثال دے
میں تھک گئی ہوں جہد مسلسل سے اے خدا
کشتی میری بھنور سے کنارے پر ڈال دے

**مہرین جبار ..... سرگودھا**
مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

**ارم کمال ..... فیصل آباد**